بِسمِ اللہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمْ

بیادِ بیدل حیدری

انٹرنیشنل

ادب و ثقافت

10

مدیران

شکیل سروش ، شیخ اعجاز

رابطہ کیلئے

P.O.Box:210871, Milwaukee Wi 53221, USA.
Phone:+414-350-5594, +414-943-5594
E-mail:adabosaqafat@gmail.com
shakeelsarosh@gmail.com

178-Bamboo, Ave, SE., Palm Bay, FL.32909, U.S.A.
Phone:321-674-9837
Sheikh.ijaz.ahmed@gmail.com

www.adab-o-saqafat.com

زیرِ اہتمام
فسٹ سٹیپ پبلی کیشنز امریکہ
First Step Publications, U.S.A.

ناشر
محمد عابد
مثال پبلشرز رحیم سینٹر پریس مارکیٹ امین پور بازار، فیصل آباد، پاکستان
Phone:+92 412615359- 2643841, Cell:0333-9933221
E-mail:misaalpb@gmail.com

قیمت: 200 روپے

فہرست

حمد	طاہر عدیم	7	نعت	اقبال اختر	8
سلام	سجاد حیدر	9	دُعا	جاوید اسلم	10

مضامین

اُردو غزل کے اسمائے ضمیر	طارق ہاشمی	11
مجید امجد کی نثر	شفیع ہمدم	20
عالمی امن کے فروغ میں اہلِ قلم کا کردار	ڈاکٹر محمد نظام الدین	26
پاکستان میں مصوری کے رجحانات مختصر جائزہ	پروفیسر نسیم نیشوفوز	31

نظمیں

آفتاب اقبال شمیم، احمد ہمیش، صفدر صدیق رضی، فاضل جمیلی، منصور آفاق، رامش منہاس، ہارون عثمانی، فوزیہ چودھری، احمد شہباز خاور، ڈاکٹر نگہت نسیم، ندا فاطمہ 35

افسانے

غولِ بیابانی	منشا یاد	49
یا شاعر	طاہرہ اقبال	60
چاچا خیر، خیریت	خالد محمود خان	68
گھر کا راستہ	سلطان جمیل نسیم	79
ہجر کی رات کا ستارہ!	سمیرا نقوی	85
روشن دائرہ	عظمیٰ عزیز خان	90
کرچیاں	فریال اِرم	94

رُباعیات 99

ترجمہ 101

غزلیات 105

سعید احمد اختر، یاد صدیقی، ارشاد جالندھری، جمشید مسرور، قائم نقوی، حسن عباس رضا، ترغیب بلند، نذر جاوید، مقصود وفا، طارق ہاشمی، خاور جیلانی، کمال وارث خان، شہاب صفدر، محسن شکیل، گستاخ بخاری، حسن عباسی، عامر سہیل، عدنان بشیر، سجاد حیدر، مظہر بخاری، ذوالفقار عادل، کبیر اطہر، خالد علیم، ندیم پرمار، آصف رضا، طاہرہ صفی، اشرف سلیم، شفیق مراد، فیض صحرائی، انوار قادری، فیصل ہاشمی، جاوید قاسم، ناصر بشیر، کامی شاہ، سعدیہ قریشی، غضنفر عباس سیّد، رفیق سیٹھی، محمد افضل عباسی، واصف سجاد، راحت سرحدی، رخشندہ نوید، رامش منہاس، محمود عامر، عامر عبداللہ، خالد خواجہ، مجید سالک، احمد جلیل، غلام شبیر اسد، غزالی، عرفان صادق، احمد سہیل، خالد نقاش، ضیاء پرویز، عارف حسین عارف، وصی الحسن نقاش، شفقت حبیب شفیق، تو قیر لدھیانوی، شیخ اعجاز

اپنی بات

ادب وثقافت انٹرنیشنل کا تازہ شمارہ حاضرِ خدمت ہے۔

ہم اس عزم کا اعادہ کرتے ہیں کہ اُردو زبان وادب کی ترقی کے لیے اَن تھک کوششیں جاری رکھیں گے۔ نئی نسل کو اُردو سے روشناس کرانے کے لیے بہت سے لوگ انفرادی اور اجتماعی طور پر کوشاں ہیں، لیکن نتائج اِتنے حوصلہ افزا نہیں ہیں۔ ضرورت اِس اَمر کی ہے کہ ہم سب یک جان ہو کر ایک ہی سمت میں اُردو کی اس گاڑی کو کھینچ کر منزلِ مقصود تک پہنچانے کا عزم کریں اور کوششِ پیہم سے راستوں کی رکاوٹوں کو عبور کرتے ہوئے اس مقام تک پہنچا دیں، جہاں غالب کے پرِ مرغِ تخیل کی رسائی ہو، جہاں اقبال کے خوابوں کی تعبیر ہو اور جہاں مستقبل کے سخن وروں کو باغِ اُردو کی آبیاری کے لیے مواقع فراہم ہوں۔

—ادارہ—

حمد

—طاہر عدیم—

لرزتے ہاتھوں میں اِک دُعا ہے
مزاج تیرا عطا عطا ہے

یہ میں کہ ابجد سے ناشناسا
وہ تو کہ سوچوں سے ماورا ہے

تری محبت کی روشنی سے
چراغ آنکھوں میں جل رہا ہے

ہر اِک زمانے کو آس تیری
تو ہر زمانے میں بس گیا ہے

میں جب بھی اُس کو پکارتا ہوں
مری رگوں میں وہ گونجتا ہے

میں خوش نصیبی کی اِنتہا پر
یہ تیری بخشش کی اِبتدا ہے

خوشا کہ دِل یہ ہمارا طاہرؔ
رہینِ رسم و رہِ وفا ہے

نعت

-اقبال اختر-

نہ مال و جاہ نہ تختِ سکندری کے لیے
ترس رہا ہوں ترے در کی حاضری کے لیے

تمھارے نقشِ کفِ پا سے روشنی لے کر
چراغ بانٹتا پھرتا ہوں زندگی کے لیے

نگاہِ لطف و کرم اِک نگاہِ لطف و کرم
یہی بہت ہے مرے دامنِ تہی کے لیے

زباں رہے نہ درود و سلام سے غافل
ہم اِس جہان میں آئے ہیں بس اِسی کے لیے

ملی ہے آپ سے توقیر ابنِ آدم کو
مقامِ شکر ہے اختؔر یہ آدمی کے لیے

ooo

سلام

–سجاد حیدر–

علیؑ کا طرزِ شجاعت حسینؑ لے کے بڑھے
بتول زہرؑا کی عظمت حسینؑ لے کے بڑھے

جب اہلِ جبر کے آگے تھی گنگ سب کی زباں
تو رختِ حرفِ صداقت حسینؑ لے کے بڑھے

یہ دین نرغۂ باطل میں گھر گیا جس دم
لوائے عزمِ حفاظت حسینؑ لے کے بڑھے

مقابلے میں اُدھر بولہب کی فطرت تھی
ادھر کہ نطقِ رسالت حسینؑ لے کے بڑھے

یہ صرف گود میں اصغرؑ نہیں مسلمانو
نشانِ عظمتِ وحدت حسینؑ لے کے بڑھے

نکالنے کے لیے سینۂ پسرؑ سے سناں
یہ کس مزاج کی جرأت حسینؑ لے کے بڑھے

مصلّٰی اپنا بنایا ہوا ہے نیزے کو
یہ کیسا ذوقِ عبادت حسینؑ لے کے بڑھے

شکست ہو بھی گئی اور تجھے پتہ نہ چلا
یزید دیکھ جو حکمت حسینؑ لے کے بڑھے

بدل تو سکتے تھے سجّاد نقشہ لمحوں میں
پر ایک صبر کی طاقت حسینؑ لے کے بڑھے

○○○

کیونکر لگیں نہ گھر کے در و بام مختلف
آلِ نبیؐ کے غم کے ہیں ایّام مختلف

لازم طوافِ کعبۂ کرب و بلا ہے آج
باندھا ہے آج اس لیے احرام مختلف

فردوس ہی نہیں غمِ شہہؑ کا معاوضہ
ملنا ہے ہم کو حشر میں انعام مختلف

محنت ہر اِک نبیؐ کی ہے اپنی جگہ مگر
فرزندِ فاطمہؑ نے کیا کام مختلف

قربانیِ حسینؑ کا احسان مانیے
ہوتا وگرنہ آج یہ اسلام مختلف

تھا لشکرِ یزید میں لیکن غیور تھا
حر کا ہوا ہے اس لیے انجام مختلف

عابدؑ سے رو کے پوچھیے کہ کس طرح ہوئی
اِک دوپہر میں حالتِ خیّام مختلف

سجّاد منتشر ہیں یہ کس جرم کے سبب
اس ریگزارِ گرم پہ اجسام مختلف

دُعا

-جاوید اسلم-

کیا امریکہ کیا یورپ کیا ہندو پاک
دُنیا پر ہے تری حکومت یا اللہ

چاند ستارے دیکھ کے جس کو رشک کریں
ایسی کر دے میری قسمت یا اللہ

میں مجبور ہوں لیکن اِتنا جانتا ہوں
سب سے بڑی ہے تیری قدرت یا اللہ

سات سمندر مِل کر بھی نہ لکھ پائیں
صرف ترے اِک نام کی عظمت یا اللہ

میں تیرے بندوں میں شامل ہو جاؤں
دے دے مجھ کو اِتنی عزت یا اللہ

لب پہ تیرا نام ہو سر سجدے میں ہو
رُک جائے اس دِل کی حرکت یا اللہ

ہو جائے سرشار خوشی سے یہ جاویدؔ
ہو تیری گر چشمِ عنایت

اُردو غزل کے اسمائے ضمیر

-طارق ہاشمی-

غزل کے کرداروں کی بات ہوئی ہے تو دھیان یا تو محبت کی تثلیث یعنی عاشق، معشوق اور رقیب کی طرف گیا، یا پھر مے خانے یا گلستاں سے وابستہ ناموں کی طرف لیکن وہ کردار زیرِ بحث نہیں آ سکے جو شہرِ غزل میں اسمائے ضمیر کی صورت میں متحرک نظر آتے ہیں۔

غزل کے اسمائے ضمیر کی تعبیر اگر ہوئی بھی تو زاویۂ نظر بہت محدود رہا ہے یعنی ان اسما سے مراد عموماً خود شاعر بطور عاشق اور اس کا محبوب لیے گئے ہیں یا زیادہ سے زیادہ ان کی تعبیر دو سطحوں یعنی عشق حقیقی اور عشق مجازی کے حوالے سے کی گئی، لیکن اِن اسما کے ذریعے اُن بلیغ اشارتوں کی تفہیم کی زحمت کم ہی اُٹھائی گئی، جن کی مدد سے ہمارے غزل گو ایمائی انداز میں گفتگو کرتے ہوئے اپنی سماجی ذمہ داریوں سے عہدہ براہوئے ہیں۔

غزل کے اسمائی کردار محبت کی تثلیث سے بھی تعلق رکھتے ہیں لیکن اس سے کہیں زیادہ معاشرہ کے ہر نوع اور فرد کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یہ کردار علامتیں بھی ہیں جو کسی انسانی طبقے، صنف یا مزاج سے وابستہ افراد کے اجتماع کا استعارہ بن کر اُبھرتے ہیں۔ یعنی جزو میں کل کو دکھانے کے اعجاز کا وسیلہ دراصل یہی کردار ہیں۔ مثلاً میرؔ کا یہ شعر:

سب پہ جس بار نے گرانی کی
اُس کو یہ ناتواں اُٹھا لایا

اِس شعر میں ''یہ'' سے مراد انسان بحیثیتِ کل ہے، جسے کتاب کی امانت سونپی گئی۔

اُردو غزل کے اسمائے ضمیر کی محدود تعبیر کی ایک وجہ ''عورتوں سے گفتگو'' والی مکتبی تعریف کے علاوہ اِس کی تاریخ کے بارے میں یہ بنیادی مغالطہ بھی ہے، جس کے مطابق غزل کی ابتدا حسن و

عشق کے مضامین سے ہوئی اور بعد میں اِس کے موضوعات میں رفتہ رفتہ اضافہ ہو گیا۔ اِس بنیاد پر جدید غزل گو بہت اتراتے ہیں کہ ان کے دور میں غزل کا دائرہ بہت وسیع ہوا ہے اور ان کے اشعار زندگی کے ہر موضوع کا احاطہ کرتے ہیں۔

جدید تحقیق کی روشنی میں یہ نظریہ قطعی طور پر باطل ہو چکا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب حضرتِ حکیم سنائیؒ غزنوی نے پہلی بار غزل کو ایک الگ صنفِ شعر کے طور پر اختیار کیا تو اُسی وقت سے غزل ایک زبردست سماجی صنفِ سخن کے طور پر سامنے آئی اور جناب سنائیؒ اور اُن کے معاصرین و مابعد شعرا جن میں سے بیشتر صوفیائے کرام تھے۔ معاشرے اور اِس کے مسائل کو موضوع بنایا، لیکن غزل کا مزاج چونکہ ایمائی ہے لہٰذا مقلد مزاج شعرا اِس کی ظاہری پرت کو لے کر آگے چلے، نتیجتاً غزل کے اشعار کی تفہیم بھی یک سطحی طور پر ہونے لگی۔

اُردو غزل کے کلاسیکی سرمائے کی اِسی یک سطحی تعبیر و تشریح کے باعث غزل کے اِن کرداروں کو بھی وسعتِ نظر کے ساتھ نہیں دیکھا جا سکا۔ میرؔ کے درج ذیل اشعار ملاحظہ ہوں:

جب نام ترا لیجیے تب چشم بھر آوے
اِس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے

ہر زخمِ جگر داورِ محشر سے ہمارا
اِنصاف طلب ہے تری بے دادگری کا

اشعارِ غزل کی تعبیر کے معروف زاویے مذکورہ اشعار کے اسما کی معنویت کو محدود کر سکتے ہیں لیکن اِن کو سماجی پس منظر میں دیکھیں تو شاعر دراصل اُن حملہ آوروں کے ظلم و ستم کو اُجاگر کر رہا ہے جنھوں نے دلّی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور مقہور لوگوں کے پاس سوائے تنہائی میں آنسو بہا کر چپ ہو جانے کے اور کوئی چارہ نہیں تھا۔

غالب کی تین غزلوں کے مطلعے دیکھیں:

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تمھی کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

نکتہ چیں ہے غمِ دِل اُس کو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

کب وہ سنتا ہے کہانی میری
اور پھر وہ بھی زبانی میری

اِن اشعار کی اسما کے معنوں میں جایا جائے تو متعدد کرداروں سے ملاقات اور اُن کے رویوں سے آشنائی حاصل ہو سکتی ہے۔ اگر چہ غالب کی تصوف کے نکتہ نظر سے تشریح کے باعث تین اشعار کا مخاطب خدا کو بھی قرار دیا گیا ہے، لیکن سماجی اعتبار سے اِن اشعار کے اسمائے ضمیر سے مراد وہ بدیسی حکمران بھی ہیں جن کے آگے ہندوستانی باشندے لب کشائی نہیں کر سکتے تھے۔ اِسی طرح غالب کی ایک غزل کے یہ چند اشعار دیکھیں:

بازیچۂ اطفال ہے دُنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے
اک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے نزدیک
اک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے
جز نام نہیں ، صورتِ عالم مجھے منظور
جز وہم نہیں صورتِ اشیا مرے آگے

یہاں بظاہر ایک انا پرست شاعر اپنے کبر و غرور کا اظہار کرتا ہوا نظر آتا ہے لیکن ان اشعار کی ایک وسیع معنوی سطح بھی ہے۔ عصرِ جدید میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے ذریعے انسان عناصرِ کائنات کو مسخر کر چکا ہے اور اُسے طاقت ور ترین مظہرِ فطرت بھی کمزور بلکہ ہیچ دِکھائی دیتا ہے۔ اِس تناظر میں مذکورہ استعارہ پر غور کریں تو یہ دراصل جدید انسان کا ایک مونولوگ (Monologue) بھی ہے جو اپنے سامنے کائنات کے طاقت ور مظاہر کو اپنا غلام بنانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

اُردو غزل کے اسمائے ضمیر کی عدم تفہیم یا انھیں کسی ایک رُخ میں دیکھنے کا نقصان یہ بھی ہوا ہے کہ ہم اِس صنف کی تہذیبی معنویت کو پوری طرح نہیں سمجھ پائے۔ اور اِسی بنیاد پر ہمارے بعض جدت پسند جذباتی ناقدین نے غزل کی مخالفت بھی کی۔

۱۸۵۷ء کے بعد ہمارے نظم گوؤں خصوصاً حالی اور اکبر کو بہت سراہا گیا ہے، اکبر تو لسان العصر بھی قرار پائے لیکن اِس عرصے کی بابت ہمارے ناقدین نے یہ سوال نہیں اُٹھایا کہ آیا ہماری تہذیبی صنف غزل نے بھی کوئی کردار ادا کیا یا نہیں؟ دوسری طرف اِسی دور کے شعرا کے لیے الزامات کی ایک طویل فہرست ضرور موجود ہے کہ یہ اِس آشوب کے زمانے میں بھی محبوب کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر رہے۔ اِس سلسلے میں داغ دہلوی سب سے زیادہ ہدفِ ملامت بنے۔ زبان و بیان پر عبور رکھنے کی

تحسین سے قطع نظر اُردو تنقید میں داغ کا ذِکر کہیں بھی اچھے الفاظ میں نہیں کیا گیا۔ ایک طرف انھیں طوائفوں سے نتھی کر کے دیکھا گیا تو دوسری طرف لب و لہجے کے لحاظ سے یہ کہا گیا کہ داغ کے ہاں تغزل کے بجائے واسوخت کا رنگ غالب ہے اور یہ کہ وہ ہر وقت محبوب کو جلی کٹی سناتا رہتا ہے۔

داغ کی شاعری کی سماجی معنویت ایک الگ مضمون کی متقاضی ہے۔ یہاں چند اشعار ملاحظہ ہوں اور مطالعہ کے بعد یہ سوال اُٹھائیں کہ اِن اشعار میں اسمائے ضمیر سے مراد ہماری تنقید نے آخر محبوبِ مجازی یا کوئی طوائف ہی کیوں لیا ہے؟

حالِ دِل تجھ سے دِل آزار کہوں یا نہ کہوں
خوف ہے مانعِ اظہار کہوں یا نہیں کہوں

ساز یہ کہنہ ساز کیا جانیں
ناز والے نیاز کیا جانیں

جلوہ دیکھا تری رعنائی کا
کیا کلیجہ ہے تماشائی کا

ترے خرام سے برپا ہے شور و شر کیسا
اُٹھا یہ فتنہ قیامت سے پیشتر کیسا

کیا جانے لکھ دیا تھا انھیں اضطراب میں
قاصد کی لاش آئی ہے خط کے جواب میں

برنگِ حسرت، مثالِ ارماں جو آ گیا یاں سے پھر نہ نکلا
رہے گا سینے میں تیر تیرا اسیرِ قیدِ فرنگ ہو کر

داغ کے اِن اور اِن ایسے ہزاروں اشعار کو قدرے سنجیدگی سے دیکھا جائے تو اِن میں موجود اسمائے ضمیر کسی اختر جان، حجاب یا لاڈلی بیگم سے زیادہ مارسٹن بلیک، ولیم فریزر یا جنرل ڈیوڈ کی موجودگی کا پتہ دیتے ہیں۔

اُردو غزل کی تاریخ میں اقبال واحد خوش قسمت شاعر ہیں جن کے اشعار میں ضمائر کو سمجھنے اور سمجھانے میں اُردو تنقید نے کسی کج فہمی کا ثبوت کم سے کم دیا ہے۔ اِس کی وجہ کمالِ دانش نہیں بلکہ اقبال کا فکری آہنگ ہے۔ چنانچہ اقبال کے اشعار پڑھتے ہوئے جب کوئی ضمیر آتا ہے تو اُن کے اسلوب میں پائی جانے والی علویت اپنے ناقد یا قاری کو اُس کج روی کا مظاہرہ نہیں کرنے دیتی جو دیگر شعرا کے سلسلے

میں روا رکھی گئی ہے۔

اِقبال کی شاعری کا فکری آہنگ دیہاتی اور الٰہیاتی روایت سے وابستہ ہے اور ہمارے اجتماعی شعور میں بھی یہی نکتہ راسخ ہے۔ اِس لیے اُن کی غزل میں بہت کم ایسے مقام آتے ہیں کہ ناقد یا قاری کو اُن کے ہاں ضمیر کی معنویت کا تعین کرنے میں کوئی مشکل پیش آئے۔

وہی میری کم نصیبی، وہی تیری بے نیازی
مرے کام کچھ نہ آیا یہ کمالِ نے نوازی

نہ تو زمیں کے لیے ہے نہ آسماں کے لیے
جہاں ہے تیرے لیے تو نہیں جہاں کے لیے

اگر کج رَو ہیں انجم، آسماں تیرا ہے یا میرا
مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا

اسمائے ضمیر کی غلط تعبیر کی زیادتی ہماری تنقید نے صرف غزل کے ساتھ نہیں بلکہ نظم کے ساتھ بھی کی ہے۔ ن م راشد کی ''ماورا'' شائع ہوئی۔ اُن کی منظومات ''خودکشی''، ''فرار''، ''انتقام'' اور ''رقص'' پڑھ کر ہر طرف راشؔد پر فراریت کے الزامات عائد کیے گئے۔ چنانچہ راشد کو خود اِسی اَمر کی وضاحت کرنا پڑی کہ اِن نظموں میں ''میں'' سے مراد قطعی شاعر نہیں ہے بلکہ یہ دراصل معاشرے کے مختلف طبقوں کے نمائندہ کردار ہیں۔

اُردو غزل دورِ جدید میں اپنے ارتقائی سفر میں جب ترقی پسند تحریک کی غزل تک پہنچتی ہے تو اسمائے ضمیر ایک طبقاتی کشمکش کے نمائندہ کردار بن جاتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اک طرزِ تغافل ہے سو وہ اُن کو مبارک
اک عرضِ تمنا ہے سو ہم کرتے رہیں گے (فیضؔ)

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا (مجروح)

ہمیں خبر ہے کہ ہم ہیں چراغِ آخرِ شب
ہمارے بعد اندھیرا نہیں اُجالا ہے (ظہیر کاشمیری)

منیر نیازی ترقی پسند شاعر تو نہ تھے لیکن اُن کی غزل میں اسمائے ضمیر کی شکل میں اعلیٰ طبقے کی مکروہ صورتوں کی تصویریں نمایاں ہیں:

میری ساری زندگی کو بے ثمر اُس نے کیا
عمر میری تھی مگر اُس کو بسر اُس نے کیا

ملتی نہیں پناہ ہمیں جس زمین پر
اک حشر اُس زمیں پہ اُٹھا دینا چاہیے

اُردو غزل کے اسمائے ضمیر کی تشریح کے سلسلے میں ناصر کاظمی کی ''پہلی بارش'' بھی قابلِ لحاظ ہے، جس میں من وتو کے اسماء کی معنویت اساطیری داستانوں میں بھی تلاش کی جاسکتی ہے اور تخلیقی اضطراب سے دوچار اہلِ فن کی زندگی کے تہذیبی گوشوں میں بھی۔

اُردو غزل کے اسمائے ضمیر کے سلسلے میں متعدد جدید شعرا کے کلام سے مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں لیکن اِس بابت انور شعور ایسے شاعر ہیں جنھوں نے ضمیر واحد متکلم کا استعمال ایک معنوی تنوع کے ساتھ کیا ہے۔ اُن کی غزلیات کی اکثریت ''میں'' کی ردیف میں ہے جو عہدِ حاضر کے انسان کی مجموعی بے چینی کے اظہار کے ساتھ ساتھ وجودی کرب کو بھی اُجاگر کرتی ہے۔ انور شعور کے اشعار میں مَیں کی ردیف عہدِ حاضر کے انسان کا ایسا مونولوگ (Monologue) ہے جس میں اُداسی، گھبراہٹ، خوف، طنز، ٹھٹھہ اور نفرت کے جذبات کا کھل کر اظہار کیا گیا ہے۔ اِس کے ساتھ ساتھ یہ اشعار جدید انسان کی نفسیاتی تصویر کشی بھی کرتے ہیں:

کس قدر رُسوائیاں ہیں میرے ساتھ
کیا بتاؤں کس قدر تنہا ہوں میں

بیٹ کر جاتی ہے چڑیا فرق پر
عظمتِ آدم کا آئینہ ہوں میں

آگ ہے اور سلگ رہی ہے حیات
راکھ ہوں اور بکھر رہا ہوں میں

جدید شعرا نے ضمائر کو متعدد معنوی جہات دی ہیں۔ یہاں الگ الگ ذِکر شاید طوالت کا باعث ہے لہٰذا چند اشعار اِن جہات کی طرف اشارت کی غرض سے ملاحظہ ہوں:

سرخ رو ہو کے میں اِس آگ سے کندن نکلا
شعلۂ خوں نے اُجالا مری پیشانی کو (سلیم شاہد)

جہاں بھونچال بنیادِ فصیل و در میں رہتے ہیں
ہمارا حوصلہ دیکھو ہم ایسے گھر میں رہتے ہیں (اقبال ساجد)

میرا دُکھ یہ ہے میں اپنے ساتھیوں جیسا نہیں
میں بہادر ہوں مگر ہارے ہوئے لشکر میں ہوں (ریاض مجید)

میں ایسے جمگھٹے میں کھو گیا ہوں
جہاں میرے سوا کوئی نہیں ہے (صابر ظفر)

غم کی تشریح بہت مشکل تھی
اپنی تصویر دِکھا دی ہم نے (غلام محمد قاصر)

۱۹۷۰ء کی دہائی میں شناخت بنانے والے شعرا کی غزل میں اسمائے ضمیر کی تفہیم کے لیے وہ اساطیری ماحول سمجھنے کی ضرورت ہے جس کے خوابوں میں رہتے ہوئے شعرا ماضی کی بازیافت کی سعی کر رہے تھے۔ ۱۹۷۱ء میں ایک طرف پاکستان دولخت ہو چکا تھا۔ بائیں بازو سے تعلق رکھنے والی ایک پارٹی برسرِاقتدار آ چکی تھی۔ جس کا خاتمہ ایک مذہبی تحریک کے ذریعے ہوا۔ دوسری طرف سوویت یونین نے افغانستان پر حملہ کر دیا۔ اِس تمام تر صورتِ حال میں شعرا نے اپنے ماضی کے تہذیبی سرمائے میں ڈھونڈنا شروع کر دیا چنانچہ اِس نسل کے شعرا خصوصاً شبیر شاہد، افتخار عارف، عرفان صدیقی، محمد اظہار الحق، خالد اقبال یاسر، افضال احمد سیّد اور غلام حسین ساجد کی غزل میں اسمائے ضمیر اُن داستانوں کے کردار ہیں جو اسلامی و عجمی تہذیب سے متعلق ہیں:

نگاہ میں ہے شکوہ اُس کی عمارتوں کا
وہ معبدوں کا جلال بھولا نہیں ہے مجھ کو (شبیر شاہد)

میں سو رہا تھا اور مری خواب گاہ میں
اک اژدہا چراغ کی لَو کو نگل گیا (ثروت حسین)

وفا کے باب میں کارِ سخن تمام ہوا
مری زمین پہ اک سلسلہ لہو کا بھی ہو (افتخار عارف)

تم جو کچھ چاہو وہ تاریخ میں تحریر کرو
یہ تو نیزہ ہی سمجھتا ہے کہ سر میں کیا تھا (عرفان صدیقی)

ملی ہے اِس لیے خلعت کہ میں نے زیرِ عبا
چلا تھا گھر سے تو شمشیر بھی پہن لی گئی (اظہار الحق)

وہ ایک ریگ گزیدہ سی نہر چلنے لگی
جو میں نے چوم کے پیکاں کمان پر رکھا (افضال احمد سیّد)

مبارزت طلبی میں ہے زندگی میری
جو کارزار سے پسپا کبھی ہوا تو گیا (خالد اقبال یاسر)

تمام عمر میں کرنے کا ایک کام کیا
کہ میں نے اُس کے ولی عہد کو غلام کیا (غلام حسین ساجد)

اُردو غزل کی جدید ترین نسل میں بہت سے ہونہار اور تازہ کار شعرا کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ اِن شعرا کی غزل کے کوئی خاص فکری یا اسلوبیاتی خدوخال اِس لیے ہی نمایاں نہیں کہ یہ اپنے سے ماقبل شعرا کی طرح کسی مخصوص فکر یا اسلوب کے رجحان کے ساتھ وابستہ نہیں ہیں، نہ ہی کسی اجتماعی طرزِ احساس کے ساتھ رغبتِ خاطر محسوس کرتے ہیں لیکن ایک عنصر جو اِس نسل کے امتیاز کا باعث ہے، وہ مابعد الطبیعات کی طرف میلان ہے۔ اگرچہ یہ شعوری یا کسی اجتماعی منصوبہ بندی کے تحت نہیں ہے۔ عہدِ حاضر میں سائنس کے جدید ترین اکتشافات ایسے بھی ہیں جنھوں نے سائنس کو محض فزکس تک محدود نہیں رہنے دیا بلکہ بعض تجربات اِسے ماورائے مظاہر دیکھنے کی بھی جرأت عطا کرتے ہیں۔

ہماری نئی نسل کے شعرا کی حیرت وہ استعجاب نہیں ہے جو نامعلوم کے باعث جنم لیتا ہے بلکہ یہ وہ حیرت ہے جو بہت کچھ معلوم ہونے کے بعد کی ہے۔ اِن کے سامنے مظاہرِ کائنات کوئی سوال نہیں رہے بلکہ اِن مظاہر کی حقیقت کُشائی کے بعد وہ گمبھیر پُراسراریت ہے جو ماورائے مکاں یا ماورائے زماں سے تعلق رکھتی ہے۔

ہمارے نئے شعرا کی فکر اور اسلوب ہر دو میں یہ استعجابِ نو دِکھائی دیتا ہے اور اِن کے اشعار میں ضمائر کو بھی اِسی نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہیے:

میں لخت لخت ہوا آسماں سے لڑتے ہوئے
مگر یہ خاک پہ احسان بھی نہیں میرا (قمر رضا شہزاد)

اپنے پہلے مکان تک ہو آؤں
میں ذرا آسمان تک ہو آؤں (اختر عثمان)

زمیں کو دیکھے کسی اور ہی نگاہ سے تو
جو آشنا ہو کسی روز میری آہ سے تو (افضال نوید)

آنکھیں تمھارے ہاتھ پہ رکھ کر میں چل دیا
اب تم پہ منحصر ہے کہ کب دیکھتا ہوں میں (شاہین عباس)

گر پڑا میں کسی مسمار زمانے میں تو پھر
اُس نے ملبے سے خدوخال اُٹھائے میرے (مقصود وفا)

میں پلٹ آیا تھا دیوار پہ دستک دے کر
اب سنا ہے وہاں دروازہ نکل آیا ہے (انجم سلیمی)

ایک لمحے کو زمیں ٹھہری تو جی متلا گیا
وقت کیا ساکت ہوا اُبکائی آنے لگ گئی (خاور جیلانی)

بہت اندھیرے میں رکھا گیا مجھے
ستارے کب بنے ، کوئی پتہ نہیں (ادریس بابر)

اُردوغزل کے اسمائے ضمیر کی تفہیم کے سلسلے میں یہاں چند نکات پیش کیے گئے ہیں اور جن اشارات کی نشان دہی کی گئی ہے یہ بھی حتمی نہیں۔ مقصود صرف یہ ہے کہ ان اسما کی ماہیت کو سمجھنے کی ضرورت ہے جسے محسوس نہیں کیا گیا یا کم کیا گیا ہے۔

اسمائے ضمیر، اُردوغزل کے اسلوب کا امتیاز ہیں۔ یہ وہ اسلوب ہے جسے بعدازاں ہماری نظم نے اختیار کرتے ہوئے اُس طرز کو ایجاد کیا جسے ایلیٹ شاعری کی تیسری آواز سمجھتا ہے۔ یہ وہ اسلوب ہے جو جدید افسانوی ادب کا بھی ایک قرینہ ہے، جس میں کہانی کار اسمائے معرفہ کے کردار تراشنے کے بجائے غائب یا متکلم کے کردار تراش کر کہانی کو کئی معنوی پرتیں عطا کرتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ غزل کی جن صفات کے باعث ہم اِس صنف کو دوسری اصناف سے ممتاز سمجھتے ہیں اُن کا بنیادی وسیلہ اسمائے ضمیر ہیں۔ جامعیت، اختصار، ایمائیت، اشاریت و رمزیت یہ وہ سب صفات ہیں جو اسمائے ضمیر ہی کی بدولت پیدا ہوتی ہیں۔ لیکن امر افسوس ہے کہ اردوغزل کے تفہیم کے سلسلے میں ہماری تنقید نے جہاں اور بہت سی زیادتیاں کیں، وہاں اِن اسمائے ضمیر کو بھی محدود زاویوں سے دیکھ کر غزل کی تہذیبی وسعت سے بےاعتنائی برتی گئی ہے۔

ooo

مجید امجد کی نثر

- شفیع ہمدم -

اُردو نظم میں مجید امجد کا شمار صفِ اوّل کے ممتاز شعرا میں ہوتا ہے۔ دوسرے شعرا کی نسبت ان کے یہاں زیادہ تنوع، رنگا رنگی اور شعریت پائی جاتی ہے۔ انھوں نے جس مہارت اور سلیقے سے لفظوں کو اپنی نظم کی شال میں ٹانکا ہے۔ اس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔ وہ ساتویں جماعت سے شعر کہنے لگے تھے۔ ان کا زیادہ رجحان نظم کی طرف تھا۔ اس لیے غزل اور نثر کی طرف کم توجہ دے پائے۔ چنانچہ ان کی نظموں پر تو بکثرت مضامین لکھے گئے مگر غزل کی طرف کم توجہ دی گئی اور نثر کی طرف تو بہت ہی کم دھیان دیا گیا۔

مجید امجد ہفت روزہ ''عروج'' جھنگ کے ایڈیٹر بھی رہے۔ انھوں نے دیباچے اور پیش لفظ بھی رقم کیے۔ اداریے بھی لکھے، تراجم بھی کیے، فکاہی کالم اور خطوط بھی تحریر کیے۔ اگر چہ انھوں نے نثر زیادہ نہیں لکھی مگر اِن کی نثر میں جو حسن، دلآویزی اور کشش ہے وہ قاری کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی بھر پور صلاحیت رکھتی ہے۔ ان کی شاعری کی طرح نثر بھی اپنے منفرد لہجے کی وجہ سے فوراً پہچانی جاتی ہے۔ مجید امجد کی نثر سے بھی ہم اپنے ذوق اور فنی ارتقاع کی تربیت کرتے ہیں۔ ان کی نثر غیر مانوس الفاظ اور نوتراشیدہ تراکیب کے پردوں میں مخفی نہیں ہوتی کہ ابلاغ کا مسئلہ کھڑا ہو جائے۔ وہ سادہ، سلیس اور رواں زبان میں اپنے خیالات کا اظہار مؤثر اور دِلنشین انداز میں کرتے ہیں کہ نثر میں بھی نظم کا سا لطف آتا ہے۔ شیر افضل جعفری کے شعری مجموعے ''سانولے من بھانولے'' کے حرفِ اوّل میں اپنے خیالات کا اظہار کتنی عمدگی سے کیا ہے۔

''ہم جب ان کی نرم و گداز نظموں کو جن کے جسم پر غزل کا شبنمیں پیراہن ہے اور لطیف و جمیل غزلوں کو جن کی رُوح کے اندر ایک سرشار نظمیت لڑ کھڑا

رہی ہے۔ پڑھتے ہیں تو کبھی یوں محسوس کرتے ہیں گویا کسی نے ہمارے ارضی رِشتے کاٹ دیئے ہیں اور ہم کسی ان بوجھی کسک کے تحت کھوئے کھوئے سے ان منزلوں کی طرف رواں ہیں جہاں شعلوں کی وادیوں میں وفاؤں کے گلزار مہک رہے ہیں۔''

مجید امجد کی نثر نغمیّت، نظمیت اور لطافت سے لبریز ہوتی ہے۔ جس کی قرات سے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم کسی عمدہ نظم پارے کا مطالعہ کر رہے ہوں۔ وہ لفظوں کی عظمت، حرمت اور منزلت سے بخوبی واقف تھے اور انھیں استعمال کرنے کا ہنر بھی جانتے تھے۔ وہ بخوبی واقف تھے کہ ہر لفظ کے اندر ایک جادو ہوتا ہے، جب تخلیق کار اس لفظ کو مہارت سے استعمال کرتا ہے تو اس کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ مجید امجد نے ڈاکٹر وزیر آغا کی نظموں پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کفایت لفظی کا استعمال اتنی عمدگی سے کیا ہے کہ ایک طویل مضمون کو چند سطور میں مقید کر دیا ہے۔ مندرجہ ذیل اقتباس میں لطافت بھی ہے نزاکت بھی، طرفگی بھی اور فصاحت بھی۔

''ان نظموں میں بات کہیں گہری کہیں گمبھیر، کہیں چنچل ہے، اس کی لانبی زلفیں سونے کے باریک مہین تاروں کی طرح لہراتی ہیں۔ آپس میں اُلجھتی ہیں۔ موضوع نازک ہیں ادق نہیں۔ اشارے بلیغ ہیں مبہم نہیں۔ علامتیں فکر انداز ہیں ژولیدہ نہیں۔ کہیں بھی تصنع اور کاوش کا نشان نہیں ملتا۔ کہیں بھی کوئی شعوری اُلجھن کوئی بناوٹی خیال آرائی قاری کو نہیں کھٹکتی۔ کسی بات پر کسی بلند بانگ فلسفے کی چھاپ نہیں۔''

الفاظ نگینوں کی مانند ہوتے ہیں۔ ایک اچھا تخلیق کار اپنی زبان کی شال پر دوسری زبان کے نگینوں (الفاظ) کو اِتنی مہارت سے ٹانکتا ہے کہ شال کی شان بھی بڑھ جاتی ہے اور نگینوں کی قیمت میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ مجید امجد اُردو زبان میں پنجابی کے الفاظ کے استعمال کو معیوب خیال نہیں کرتے تھے۔ وہ اُردو اور پنجابی کو دو ایسے قالب سمجھتے تھے جو ایک دوسرے سے مشابہ ہیں۔

''الفاظ پنجابی کے ہوں یا اُردو کے دونوں مقدس ہیں۔ شیر افضل جعفری نے اپنی شاعری میں پنجابی کے الفاظ اِتنی کثرت سے استعمال کیے ہیں کہ پنجابی لفظوں کا یہ استعمال ان کی پہچان بن گیا ہے۔''

وہ شیر افضل جعفری کے شعری مجموعہ ''سانولے من بھانولے'' کے حرفِ اوّل میں پنجابی کے استعمال کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اگر راوی چناب کے علاقوں کے وہ لفظ جنھیں وہاں کے لاکھوں انسان اپنی روزمرہ کی بول چال میں استعمال کرتے ہیں۔ شیر افضل جعفری کے

شعروں میں آ گئے ہیں تو انھیں غیر مانوس نہیں کہا جا سکتا ایک تو اِن بولیوں کے الفاظ کا تاریخی رِشتہ مسلّم ہے۔ دوسری طرف ان الفاظ کا اس روایت کے ساتھ گہرا تعلق ہے جو اِن اشعار میں مضمر اور منعکس ہیں۔''

بعض شعری مجموعوں کے دیباچے رقم کرتے ہوئے مجید امجد نے اگرچہ تفصیل سے گریز کیا ہے لیکن اختصار میں بھی نقد کا معیار برقرار رکھا ہے۔ وہ شاعر کی شعری معنویت کے اُس جوہر تک رسائی کی کوشش کرتے تھے، جو اُس کی تخلیقی قوت اور تاثیر کا باعث ہوتا تھا۔ اِس سلسلے میں منیر نیازی کے مجموعۂ کلام ''جنگل میں دھنک'' کے دیباچے سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''۔۔۔ خیال اور جذبے کی اَن دیکھی دُنیاؤں کے پرتو فطرت کے رنگوں اور خوشبوؤں میں تحلیل ہوتی نظروں کی جاگرتی، تیرتی بدلیوں کے سایوں میں روتے دِلوں کی کروٹ جو اِس کے شعروں اور شبدوں میں مجسم اور جاوید ہو کر رہ گئی ہے۔ اُردو نظم کے مرحلہ ہائے ارتقا کی ایک جاندار کڑی ہے۔''

مجید امجد کے بارے میں یہ خیال عام ہے کہ وہ سنجیدہ، متین، افسردہ، مردم بیزار اور خلوت نشین انسان تھے مگر یہ درست نہیں ہے۔ انھوں نے شاعری میں کہیں بھی مریضانہ مایوسی اور کم ہمتی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ وہ دوستوں کے ساتھ ہوٹلوں میں بھی وقت گزارتے تھے۔ خطوط کا جواب بھی بڑی باقاعدگی سے دیتے تھے۔ خطوط اور فکاہی کالموں میں پھلجھڑیاں بھی چھوڑتے تھے۔ ان کے خطوط اور کالموں میں شگفتگی بھی ہے لطافت بھی، طنز بھی ہے اور ظرافت بھی۔ وہ ایک خط میں کبیر انور جعفری کو لکھتے ہیں:

''اب آپ خدارا اس سوانگ کو ختم کیجیے۔ ٹھیک ہے آپ بیمار تھے۔ اچھا ہوا اب آپ اچھے ہیں۔ انسان کی عظمت بیماری میں نہیں صحت میں ہے۔ بلا تاخیر مزید کے تندرست ہو جائیے اور اپنے تازہ افکار سے نوازیئے۔ آپ کا فارسی کلام نظر سے گزرا۔ باقی اشعار عرفی اور نظیری کے لہجے کو بھی مات کر رہے ہیں۔ البتہ ایک جگہ سرگستاں (بمعنی سر پھرے) آپ نے باندھا ہے۔ اس کی کوئی سند؟ اب آپ غزل طبرانی یا فرانسیسی زبان میں بھی کہیں کم از کم چینی زبان میں ہی سہی۔''

کبیر انور جعفری کو ایک اور خط میں لکھتے ہیں، جس میں ان کا مزاح اور جعفری صاحب کی معصومیت باہم آمیز ہو کر خوب مزہ دیتی ہے:

''رہ گیا معاملہ آپ کی غزل کے انگریزی ترجمے کا اس کے بارے میں آپ براہِ راست ایڈیٹر صاحب سے بات کریں۔ کیسے کیسے خیالی پلاؤ آپ بھی وہاں

بیٹھے پکار رہے ہیں۔ انگریزی ایڈیشن ضلع منٹگمری کے ترقیاتی منصوبوں کے بارے میں اوراس میں طبع ہوعہد انحطاط اسلام کی ایک یادگار صنفِ غزل اور وہ بھی آپ کی۔"

مجید امجد فکاہی کالم "اشارات" میں ایک جگہ رقم طراز ہیں:

"حقّوں کی پوری شان وشوکت صرف پنجابی زمینداروں کے ڈیروں پر نظر آ سکتی ہے اور پنجاب کے نائٹ سکولوں میں حقے رکھ دیئے جائیں تو نہ صرف زمیندار ہی کھچے چلے آئیں گے بلکہ ان کے ساتھ ان کے خادم بھی چلے آئیں گے جو ڈیروں پر چلموں میں آگ بھرتے ہیں۔ اُپلوں کی دھونی کو سلگاتے ہیں۔ حقے میں پانی ڈالتے ہیں اور حقے کا پیچوان پکڑ کر بیٹھتے ہیں اور باری باری ہر آدمی کے پاس اس کو گھماتے رہتے ہیں۔ انسانی مساوات کی سچی مثال اگر کہیں نظر آ سکتی ہے تو زمیندار کے ڈیرے پر نظر آ سکتی ہے۔ جہاں ہزاروں مربعوں کا مالک نواب اور ٹکے کا مراثی ایک ہی حقے کو منہ لگا کر پیتے ہیں۔"

مردم بیزار اور زندگی سے اُکتایا ہوا شخص ایسے شگفتہ خطوط اور فکاہیہ کالم کیسے لکھ سکتا ہے۔ ایسی شاداب تحریر لکھنے والا زندگی سے پیار بھی کرتا ہے اور اسے ہر حال میں گزارنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ مجید امجد نے زندگی کو تمام تر تکالیف کے ساتھ قبول کیا اور نہایت پامردی، خوش دِلی اور خودداری سے بسر بھی کی۔ 1973ء کے سیلاب پر صفدر سلیم سیال کی ایک نظم "ہمارا گاؤں ہمارے بچے" فنون میں چھپی تھی۔ مجید امجد کو وہ نظم پسند آئی۔ انھوں نے اپنی پسندیدگی کا اظہار تحریر کردہ ایک خط میں کیا تھا۔ اس خط کو صفدر سلیم سیال اپنی ادبی زندگی کا قیمتی سرمایہ سمجھتے ہیں۔ خط اگرچہ مختصر ہے مگر مجید امجد کے جملوں میں جو جامعیت اور کاملیت ہے وہ کفایت لفظی کی بہترین مثال ہے۔ خط ملاحظہ کیجیے:

"آپ کی نظم ۔۔۔ سیلاب کے بارے میں فنون میں پڑھی۔ نظم بے حد پسند آئی۔ بڑی لاجواب، بے مثال اور لازوال نظم ہے۔ جس کی نازک آبگوں مواج سطروں کو وقت کا کوئی سیلاب منہدم نہیں کر سکے گا۔ آپ آج کل کہاں ہیں۔ جھنگ میں، احمد پور کہ ملتان میں، میں تو یہاں پڑا ہوا ہوں ۔۔۔ مجید امجد"

مجید امجد جو 1914ء میں جھنگ میں پیدا ہوئے۔ عمر کا بیشتر حصہ ساہیوال میں گزارا 1974ء میں جھنگ میں پیوندِ خاک ہوئے۔ انھیں جھنگ کے دیہاتوں، کھیتوں کھلیانوں، ٹیلوں، بانسری کی مدھر آوازوں پنگھٹ پر پنہاریوں کے جھرمٹوں، چلتے ہوئے کنوؤں، بہتے ہوئے پانیوں، ہیروں، رانجھوں، جیالے گھبروؤں متوالے چرواہوں غرضیکہ جھنگ کا ذرہ ذرہ بہت عزیز تھا۔ انھوں نے کبیر انور جعفری

کے شعری مجموعہ ''لب سرخ'' پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے۔ جھنگ سے اپنی قلبی وابستگی اور اٹوٹ محبت کا ذِکر اتنے مؤثر انداز میں کیا ہے کہ اس کی قرأت سے قاری کو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ خود اپنی آنکھوں سے اس علاقے کو دیکھ رہا ہو۔ یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے جس میں انھوں نے کبیر انور جعفری کی شاعری کے حوالے سے جھنگ کی منظر کشی کی ہے:

> ''جھنگ دیس کے دیہات، ان کی رنگینیاں، ان کی روندی ہوئی تلخیاں، ہنستی ہوئی رونقیں، ان کے مناظر ان کے باسیوں کے دُکھڑے تھل ریگ زاروں کے ٹیلوں کی ات جوانیاں اور شاداب سبزہ زاروں میں پھیلی ہوئی اُداس نزہتیں، بچھڑے دِلوں کی دھڑکنیں، بانسریوں کی دلگداز موسیقیاں کھیت، پنگھٹ، قافلے، جاوے، گیت غرضیکہ ایک خطہ ارضی کے سارے ہنگامے ان کے شعروں کے اندر جیتی جاگتی تصویریں بن کر زندہ ہیں۔ یہ سب ان کے قلم کا اعجاز ہے اور یہ معجزہ کاری ان کی عمر بھر کی مشق، محنت اور ریاضت کا نتیجہ ہے۔''

مجید امجد نے جس بھی تخلیق کار میں جوہرِ تخلیق کی آب کو محسوس کیا، اُسے منفرد الفاظ میں سراہا۔ فی زمانہ جب کہ کتابوں کے دیباچوں اور مضامین کے پس منظر میں کئی معاشرتی عوامل بھی کارفرما ہوتے ہیں۔ مجید امجد نے بعض ایسے شعرا پر بھی اپنے تنقیدی خیالات رقم کیے ہیں جو زیادہ تر گوشہ نشیں رہے یا اُن کی شہرت اخباری شعرا کی نسبت نہایت کم ہے۔ مراتب اختر کا نام صرف سنجیدہ اہلِ قلم جانتے ہیں۔ مراتب اُن شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ جعفری نے ۶۰ کی دہائی میں ادب کے سنجیدہ حلقوں میں اپنا معیار منوالیا تھا۔ مجید امجد اُن کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''اِن اشعار پر مکاشفوں کا گمان ہوتا ہے۔ اپنے تاثر پر اپنا اعتقاد، اپنے اعتقاد پر اپنا ایمان، اپنے اسی اطمینان کا وقار، اِن کے ہر شعر سے جھلکتا ہے۔ جابجا ایک ضبط ہے۔ جس کی اپنی تمکنت ہے۔ ایک شکستگی ہے، جس کا اپنا جلال ہے۔ ایک کربِ مہجوری ہے، جس میں گراوٹ نہیں متانت ہے۔ ایسا احساس ہوتا ہے جیسے محبوب کے ساتھ بات کرتے وقت شاعر کے لہجے میں محبوب کا اندازِ رضامندی اس میں شامل ہو گیا ہے۔۔۔ جہاں خارجی اشیاء کا بیان ہے، وہاں یوں لگتا ہے جیسے یہ اشیاء اپنا ٹھوس وجود رکھتے ہوئے بھی بے جسم ہیں اور شاعر کے شعور کا حصہ ہیں جسم کے باہر جس قدر موجودات ہیں اِن کی حقیقت و ماہیت خود شاعر ہی کے احساس کا پیکر ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں۔ ساری دُنیا اس کی رُوح کا لباس ہے۔''

مجید امجد اپنے ایک تنقیدی مضمون ''کیا موجودہ ادب روبہ زوال ہے؟'' میں 1959ء میں لکھی جانے والی غزل کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مشاہدے اور تجربے سے اپنے جذبات کی دھڑکن کو الفاظ کا خوبصورت پیرہن پہنانا غزل کی اساس ہے۔ بعض لوگ جن کے پاس کہنے کو کوئی بات نہیں ہوتی۔ وہ لفظوں کی بازیگری سے لوگوں کو حیران تو کر سکتے ہیں متاثر نہیں۔ ان کا کلام اس شعریت سے محروم ہوتا ہے جو جذبے کی دھڑکن سے پیدا ہوتی ہے اور یہی جذبہ غزل کی جان ہے۔ انھوں نے چند سطور میں اصل غزل گو شعرا کی اِتنی عمدگی سے نشان دہی کی ہے کہ ادب کا عام سا قاری بھی ان کی بات آسانی سے سمجھ جاتا ہے۔

> ''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگوں کے پاس کہنے کی کوئی بات نہیں لیکن اچھوتی زمینوں کے ردیف وقوافی کے خمیر سے اور نوتراشیدہ تراکیب اور غیر مانوس الفاظ کے پردے میں وہ ایک ایسا طلسم اظہار بپا کر لیتے ہیں جو قاری کو ایک حیران کن دُنیا میں لا کر کھڑا کر دیتا ہے۔ اس دُنیا کے اندر ہر صنعت گری اور رنگینی ہوتی ہے لیکن جذبے کی دھڑکن نہیں۔''

مجید امجد نے اشرف قدسی کے شعری مجموعہ کا پیش لفظ تحریر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ تقسیم ملک کے وقت اشرف قدسی کی عمر دس برس تھی۔ وہ خاک اور خون کے سمندر کو عبور کرتا ہوا پاکستان پہنچا۔ غربت کے تھپیڑے کھاتا ہوا پاکستان کے مختلف ادوار کے طوفانوں میں بہتا رہا۔ جب وہ ان واقعات کو سرزمینِ وطن کے حوالے سے نظم کرتا ہے تو اس کی یہ طویل نظم سراپا درد و سوز میں ڈھل جاتی ہے اور بے چشمِ نم اس کی قرأت کرنا دُشوار ہو جاتا ہے۔ اس مضمون میں ان کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> ''یہ اشرف قدسی کی پہلی کاوش ہے، یہ کوئی قصۂ رنگ و بو نہیں۔ اسے بیان کرنے کے لیے پھولوں کی سیج درکار نہیں۔ یہ کہانی ایک قوم کے پُر آشوب عہد کی حکایت ہے۔ وہ اشک خون میں لتھڑی ہوئی پلکوں سے لکھی جاتی ہے۔''

مجید امجد نے نثر میں بھی اپنے خیالات اور جذبات کو اِتنی خوبصورتی سے لفظوں کے بندھن میں باندھا ہے کہ لفظ اور خیال سے پھوٹنے والی روشنی سے دِل و دماغ اور فکر و نظر منور ہو جاتے ہیں۔ انھوں نے اپنے دوستوں اور اقربا کو خاصی تعداد میں خطوط تحریر کیے تھے۔ (صرف کبیر انور جعفری کو تحریر کردہ خطوط کی تعداد ڈیڑھ سو کے قریب ہے۔ جو اِس وقت اِن کے صاحبزادے ظفر احمد پوری کی تحویل میں ہیں) انھیں اکٹھا کر کے شائع کرنے کا بندوبست ہوا تو اِن کی نثر پر جمی ہوئی وقت کی گرد خود بخود دہٹ جائے گی اور بطور نثر نگار بھی وہ کھل کر سامنے آجائیں گے۔

عالمی امن کے فروغ میں اہلِ قلم کا کردار

—ڈاکٹر محمد نظام الدین—

''ماضی کا فن کار ظلم وتشدد کے موقع پر کم از کم خاموشی اختیار کر سکتا تھا۔
ہمارے اپنے زمانے میں جبر وتشدد نے اپنی شکل بدل لی ہے، جب صورتِ حال یہ ہو
تو فن کار خاموشی یا غیر جانب داری کیسے اختیار کر سکتا ہے؟ اسے کوئی نہ کوئی رستہ،
موافقت یا مخالفت کا اختیار کرنا پڑے گا۔ بہر حال آج کے حالات میں میرا مؤقف
یقیناً مخالفانہ ہوگا۔''(البئر کامیوؔ 'Albert Camus'')

معاشرہ تحریر وتخلیق کے ذریعے خود کو تلاش کرتا ہے۔تخلیقاتِ انسانی، معاشرتی، تہذیبی اور مادی زندگی کا اہم اور منفرد اظہار ہوتی ہیں۔اِن کا تعلق پوری زندگی کے تجربوں اور خود زندگی کی رُوح کے اظہار سے ہے۔اہلِ قلم شعوری وغیر شعوری طور پر زندگی سے خام مواد لے کر ایسی دُنیا تخلیق کرتے ہیں جس کے معنی واقدار ایک طرف اہلِ قلم کے حقیقی تجربے کو دوام بخشتے ہیں تو دوسری طرف زندگی میں خیر کا اضافہ کر کے خود زندگی کو تازہ دم کر دیتے ہیں لیکن ایسا اُسی وقت ممکن ہے جب لکھنے والا سنجیدہ ہو، اور زندگی سے اس کا پورا تعلق ہو۔اہلِ قلم اپنے زمانے کے لیے آئینے کی حیثیت رکھتے ہیں جس میں چھوٹے بڑے، واضح اور غیر واضح سارے عکس دِکھائی دیتے ہیں۔ جو قلم کار اپنے عہد کے لیے یہ کام نہیں کرتا وہ نہ صرف غیر ذمہ دار ہے بلکہ اُس کے اہلِ قلم ہونے پر بھی شک کیا جا سکتا ہے کیونکہ سچا قلمکار معاشرہ کے اجتماعی شعور کا آئینہ دار ہوتا ہے جو اُسے اپنے احساسات سے باخبر بھی کرتا ہے اور اسے بدلتا بھی ہے۔ایسے دور میں جیسا کہ آج کا دور ہے تبدیلیوں اور احساسات کا اظہار نہ کرنا اور مصلحتِ وقت کے پیشِ نظر خاموش ہو جانا یا زہر کے پیالے سے ڈر جانا سماج اور انسانیت دونوں سے غداری ہے۔ جب ایک نظام دم توڑ رہا ہو، ایک طبقہ ختم ہو رہا ہو اور دوسرا اس کی جگہ لینے کی کوشش کر رہا ہو تو اہلِ قلم بھی

تاریخ کی اس پیش قدمی میں لازمی طور پر شامل ہو جاتے ہیں۔ ایسے میں اگر وہ مصلحت کا شکار ہو کر دم توڑتے نظام ونظریات کا ساتھ دینے لگیں تو بذاتِ خود معاشرہ کے ذہنی ارتقا میں رکاوٹ بن جاتے ہیں۔

آج کی دُنیا تاریخ کی بے رحمی کا شکار ہے اور ایک ایسے دَور سے گزر رہی ہے جہاں ہر چیز کی شکل دُھندلائی ہوئی ہے، جہاں انسانیت اور امن و آشتی کی ہر قدر بے معنی ہو کر بدامنی اور دہشت گردی کے سامنے سسک سسک کر دم توڑ رہی ہے۔ دہشت اور خونریزی نے ذہنِ انسانی کو کُہر آلود کر دیا ہے۔ ہر وقت، جگہ جگہ، کسی نہ کسی شکل میں جنگ جاری ہے۔ قوموں، نسلوں، زبانوں، فرقوں اور طبقات کے مابین جنگ کے پیچھے مفادات کی ایک دُنیا ہے۔ ایسے میں امن کا قیام کثیر الجہتی ہے۔ طاقتور کی حاکمیت کے لیے سازگار حالات یا کمزور کے لیے تحفظ کے اسباب، اس کے پیچھے بھی مفادات کی ایک دُنیا ہے۔ ہر لمحہ جنگ کی صورتِ حال نے خوف اور بدامنی کا طوفان برپا کر رکھا ہے چنانچہ اس وقت عالمی امن کا قیام فروغِ انسانیت کا تقاضا ہے۔

لیکن آج کے گمبھیر حالات میں عالمی امن کی بھی کئی توضیحات ہیں۔ عالمی سامراجیت کو کھل کھیلنے کے لیے پُرامن حالات درکار ہیں۔ دُنیا کے وسائل تک بغیر مزاحمت کے رسائی ایک مہیب جنگی قوت کے زیرِ سایہ ایک ایسا عالمی امن جس میں گلوبلائزیشن کا عمل پھلتا پھولتا رہے۔ اس امن کے فروغ کے لیے بھی اہلِ قلم کی خدمات ساری دُنیا میں درکار ہیں اور عالمی سامراج کو وافر مقدار میں یہ خدمات حاصل بھی ہیں۔

عالمی امن کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ دُنیا میں زخم خوردہ، مظلوم انسانوں (جو گزشتہ کئی عشروں سے ظلم وستم کا شکار ہیں اور ایک انقلاب کے خواہاں ہیں۔ یہ انقلاب کسی نہ کسی کے خلاف تو ضرور ہوگا) میں انتقام کی آگ نہ بھڑک اُٹھے۔ وہ اپنی حالتِ زار کو مقدر سمجھ کر گہری نیند سو جائیں۔ بصورتِ دیگر انتشار اور بدامنی پیدا ہوگی اور امن برباد ہو جائے گا۔ اہلِ قلم کو یہاں بھی اچھی خاصی قیمت مِل جاتی ہے۔ کچھ اہلِ جنوں قلم وقرطاس کے سہارے شوقِ شہادت بھی پیدا کرتے ہیں ان کا خیال ہے جب تک عدل وانصاف اور مساوات نہیں ہوگی۔ امن فروغ نہیں پائے گا۔

عالمی امن کی ایک اور جہت تحلیل ہوتی ہوئی ریاستوں، پسماندہ قوموں، مفلس اور جاہل نسلوں کو بھی درکار ہے تاکہ وہ اپنی بقا کی جدوجہد بغیر کسی خونریزی کے کر سکیں۔ اپنی مرضی سے بنائے ہوئے ایجنڈے کی تکمیل، بغیر کسی بیرونی مداخلت کے کر سکیں۔ اس امن کا تقاضا یہ ہے کہ عراق، افغانستان، کشمیر، افریقہ اور لاطینی امریکہ میں جنگ ختم ہو جائے، عوام اپنی مرضی کا نظام اور حکومتیں قائم کریں۔ یہاں بھی اہلِ قلم کی بڑی قبیل برسرِ پیکار ہے۔

قلم بھی تو دو دھاری تلوار ہے جو حملہ بھی کرتا ہے اور مزاحمت بھی۔ امن اور جنگ دونوں کے پاس ''قلم کار'' ایک کارندے کے طور پر کام کرتا ہے۔ قلم نفرتوں کو اُبھارتا ہے، جنگی ترانے لکھتا ہے، رجز تخلیق کرتا ہے، ستم زدہ انسانوں کے بین لکھتا ہے، نوحے رقم کرتا ہے، ہر ایک جواز کا ساتھ دیتا ہے۔ اپنی ماہیئت میں نہ جنگ کا کوئی ضمیر ہے نہ قلم کی کوئی اوقات۔ سوال صرف اِتنا ہے کہ ہتھیار کس کے ہاتھ میں ہے۔

آج دُنیا اندرونی و بیرونی طور پر ایک ڈھا دینے والی کشمکش کے کرب میں مبتلا ہے اور ضرورت محسوس کر رہی ہے کہ موجودہ سماجی و سیاسی اداروں اور اخلاقیات و اقدار کا از سرِ نو جائزہ لے کر انھیں سلجھائے، تاکہ نئی اقدار کی تشکیل ممکن ہو سکے۔ لیکن ہمارا منجمد نظامِ فکر گلے میں ہڈی کی طرح اٹک گیا ہے۔ تاریخ کے جدلیاتی شعور کے کیمیاوی امتزاج کی تلاش اور ذہنی کشمکش کی اکھاڑ پچھاڑ ہی ہمارے اس تہذیبی تعطّل کا حقیقی سبب ہے۔ ایسی پیچیدہ صورتِ حال میں ہی اہلِ قلم کی ذمہ داری اور ان سے حلف وفاداری اٹھوانے کے مسائل سامنے آتے ہیں کیونکہ کسی بھی سماج اور تہذیب میں نیا احساس، تازہ افکار اور نیا شعور اہلِ قلم کے وسیلے سے ہی داخل ہوتا ہے۔ چنانچہ رُوحِ عصر اہلِ قلم سے مطالبہ کرتی ہے کہ ان لمحوں کو اپنی گرفت میں لائیں جو آج دُنیا پر سے گزر رہے ہیں جیسے جیسے ہمارا نظامِ خیال اپنی بدلی ہوئی صورت میں حرکت میں آتا جائے گا، ہماری تخلیقی قوتوں کے سوتے بھی ہر سمت میں کھلتے جائیں گے۔

اہلِ قلم نے ہمیشہ اپنے عہد کو متاثر کیا ہے، اسے بدلا ہے، اسے نیا دماغ اور نئی فکر دی ہے، اسے پھیلایا اور بڑا کیا ہے، اور ہمیشہ ''عظیم احمقوں'' کے سامنے ''نہیں'' کہنے کی جرأت کی ہے۔ لکھاری معاشرے کا ذمہ دار شخص ہوتا ہے۔ کوئی محسوس کرے یا نہ کرے، لیکن قلم کار ہر لمحہ کو، ہر واقعہ کو صحیح پس منظر میں سب سے پہلے سمجھ لینے کی صلاحیت اور قوت رکھتا ہے اور پھر اسے دوسروں تک پہنچانا اور روشنی دِکھانا اس کا فرض بن جاتا ہے۔ ژاں پال سارتر نے کہا تھا کہ ''ادیب لکھتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے یہ فرض سنبھال لیا ہے کہ اس دُنیا میں جہاں آزادی کو ہر دم کھٹکا لگا رہتا ہے، آزادی کے نام کو آزادی سے مخاطب ہونے کی سرگرمی کو جاوداں بنا دیا جائے۔'' اہلِ قلم کو آج یہ فریضہ انجام دینا ہے۔

آج ادیبوں اور دانشوروں کی بڑی تعداد کے سامنے یہ کہنے کی جسارت کروں گا کہ حیات و کائنات کے مسائل کا علاج محض فقرے بازی کے تعویذ گنڈوں سے ممکن نہیں۔ دُنیا کو قلمی ہرکاروں اور گورکنوں کی بجائے ایسے اہلِ قلم کی ضرورت ہے جو زندہ رہ کر موت کا قلمی تجزیہ کرنا جانتے ہیں۔ جو کسی شاعر یا نثر نگار کی درجن بھر خصوصیات گنوانے، روایتی انداز میں غزلیں، نظمیں کہنے یا بندھے ٹکے موضوعات پر افسانے لکھنے کی بجائے عصری مسائل پر غور و فکر کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں، جو روایت کو اپنا کر روایت کو توڑنے کی قوت کے حامل ہوں، جو عالمی مسائل کے حل کے لیے تبدیلی کا نیا شعور دینے کا

حوصلہ رکھتے ہوں۔ قطع نظر اس بات کے کہ دُنیا ہر لحہ ایک مہیب عالمی جنگ کے سائے میں ہے، یہ طے ہے کہ یہ ان مفتوحہ قوموں کی مانند نہیں ہے جو صدیوں تک محض حملہ آوروں کا انتظار ہی کرتی رہتی تھیں۔ یاد رہے کہ انسان کا مقدر صفحۂ ہستی سے معدوم ہو جانا نہیں بلکہ کائنات کی پستیوں میں پھیلی ابدی حرکت سے ہم آہنگ ہونا ہے۔ دُنیا کو بدامنی کے اندھیروں سے نکلنا ہوگا۔ آج ہمارے پاس روشنی کی طرف سفر کرنے کے لیے زبردست صلاحیت موجود ہے۔ اہلِ قلم کو خود احتسابی کے ذریعے اس صلاحیت سے رِشتہ جوڑنا ہوگا۔ یہ اسی صورت ممکن ہے جب ہم ذاتیات ونظریات سے بالاتر ہوکر انسانیت کا ساتھ دیں گے۔ خود احتسابی بہت مشکل کام ہے لیکن یہ اُن پر فرض ہو جاتی ہے جو حق وانصاف اور امن و آشتی کی اُڑتی ہوئی دھجیوں سے نظریں بچا کر اور کترا کر نکل جاتے ہیں۔ کوئی اہلِ قلم اپنے عہد کی اجتماعی دانش سے ماورا تخلیقات فراہم نہیں کرتا، اگر کرتا ہے تو وہ محض لفاظی اور پراپیگنڈہ ہوتا ہے۔ آج کے عہد کی دانش زبردست سائنسی صلاحیت رکھتی ہے وہ تمام قوانین اور اصول جو سائنس نے دریافت کیے ہیں وہی اس عہد کی ترقی کی بنیاد بن سکتے ہیں۔ فکر اور نظریے کی فرسودگی جس نے ماضی میں انسانوں پر جنگیں ہی جنگیں مسلط کیں، سائنس نے ان کو شکست دے دی ہے۔ سائنس کی اس فتح میں اہلِ قلم کو حصہ دار بننا چاہیے، یہی وہ حصہ داری ہے، جو اہلِ قلم وفکر کو ایک باوقار عالمی امن کی جانب لے جائے گی۔

کسی نے کہا تھا کہ ''امنِ عالم کے لیے ایک جنگ ہونی چاہیے۔'' یہ جنگ تلوار سے بھی ہو سکتی ہے قلم سے بھی۔ چلی کے پیبلو نرودا (Pablo Neruda) نے یہ جنگ قلم سے لڑی فرانز فینن (Frantz Fanon) نے بھی ایسا کرنے کی کوشش کی۔ فرانس کے مفاد میں ژاں پال سارتر (Jean Paul Sartre) بھی اس جنگ کا داعی تھا۔ فیض احمد فیض کا قلم بھی اس امن کو ترستا رہا۔ آج بھی اہلِ قلم اس جنگ میں شریک ہیں مگر ضرورت حکمت ودانائی کی ہے کہ پہلے وہ حدود طے کر لی جائیں جو عالمی امن کو جنم دیں۔ یا اگر وہ موجود ہیں تو اسے فروغ دیں۔ یہ حدود پر مبنی ہیں انسانوں کے حقوق، ان کی آزادی اور عزت واحترام پر۔ یہ سب کچھ کسی نئے عمرانی معاہدے یا بڑے سیاسی منشور سے ہی ہو گا۔ اہلِ قلم کا فرض ہے کہ وہ اس سیاسی منشور کو دُنیا کے سامنے لے کر آئیں، لوگوں کے ذہنوں کی آبیاری کریں اور انسانی قوت کو اِس جارحیت کے سامنے لا کھڑا کریں جو امن اور جنگ دونوں ہتھیاروں سے انسانوں کے خلاف جاری ہے۔

دُنیا میں اس وقت عالمی امن نہیں ایک عالمی ڈیٹرنس قائم ہے۔ یہ ڈیٹرنس (Deterrence) ایک ایسا آتش فشاں ہے جو انسانی کائنات کو کبھی بھی کسی وقت بھی جلا کر بھسم کر سکتا ہے۔ انسانوں کی حاصل کردہ ایٹمی صلاحیت اُسے ایک دفعہ نہیں کئی دفعہ موت کی نیند سلا سکتی ہے۔ ہمیں معلوم ہے

کہ اس طاقت کے پیچھے ایک خوف ہے اور یہ خوف محض نفسیاتی ہے بلکہ اسے Ownershipاور Status Quo نے پیدا کیا ہے۔ یہ طبقاتی بالا دستی کے تہس نہس ہو جانے کا خوف ہے اس کا مقابلہ ضمیر اور دانائی کی طاقت سے ہی کیا جا سکتا ہے۔ کہتے ہیں پاکیزہ قلم ضمیر کی روشنائی سے لفظ لکھتا ہے اور پھر اس لفظ کی بڑی وقعت ہوتی ہے۔ جب کہ دانائی وہ دماغ ہے جو قلم کے راستے کتاب میں پھیلتا ہے اور دُنیا کے سامنے حقیقی عالمی امن کے قیام کے لیے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں۔ یہی پیغمبروں کا راستہ ہے، یہی انقلابیوں کی راہ ہے، یہی نسل در نسل دی گئی شہادتوں کا ثمر ہے۔ قلم وقرطاس کا یہ راستہ اہلِ قلم کی میراث بنے گا، تب ہی ہم عالمی امن کی طرف بڑھیں گے۔

OOO

پاکستان میں مصوّری کے رجحانات ـــــ مختصر جائزہ

-پروفیسر نسیم نیشوفوز-

مانی و بہزاد کا نام ایرانی مصوری کا عہد زریں تھا۔ مانی مصلح قوم و پیغمبر تھا، اس نے اپنے اقوال کو خوبصورت دِکھلانے کے لیے مرقع ارژنگ تیار کیا۔ کمال الدین بہزاد کے مرقعے (مرقع نظامی و شاہ نامہ) پوری مشرقی مصوری کا نقطۂ عروج تھے۔ دراصل مانی و بہزاد کے ناموں سے عبدالرحمٰن چغتائی کا ذِکر خاص مقصود تھا۔ یعنی مرقع چغتائی و عمل چغتائی ہماری مغل منی ایچر کے نقطۂ معراج تھے۔ مرقع چغتائی بلاشبہ غالب کے خوابوں کی تعبیر دِکھائی دیتا ہے۔ مرقع چغتائی (طبع ۱۹۲۸ء) میں ۴۵ تصاویر ہیں، رنگ و پیکر کا جمالیاتی امتزاج۔ ویسے پہلے پہل چغتائی کا کام نیو بنگال اسکول آف آرٹ سے مماثل تھا۔ چغتائی بالاتفاق پہلے جدید مسلم پینٹر تسلیم کیے گئے۔

بقول شفیع عقیل ''عبدالرحمٰن چغتائی مسلمانوں کی تہذیب وثقافت اور تاریخ کے مصور تھے۔''

لاہور کے دبستان مصوری کے ایک اور بڑے استاد حاجی محمد شریف تھے۔ آپ پٹیالہ سے ہجرت کر کے لاہور آئے تھے۔ آپ کو ''مصور پاکستان'' کا خطاب دیا گیا۔ استاد اللہ بخش ہندوانہ موضوعات رادھا کرشن کو اپنانے کے سبب بے حد مقبول ہوئے اپنی عمر کے آخری سالوں میں وہ پنجاب کے مختلف النواع مناظر کو اَمر کر گئے۔ مغل شہنشاہ اکبراعظم کے عہد میں رامائن اور مہابھارت کے مرقع تصور کیے گئے۔

وادیٔ سندھ کے سیاق وسباق میں ہم موہنجودڑو اور ہڑپہ تہذیب سے اپنا اجتماعی رشتہ اور ناطہ قائم و دائم سمجھتے ہیں۔ ہڑپہ تہذیب کے مزید آثار ڈھولاویر (رن آف کچھ انڈیا) میں دریافت ہوئے ہیں۔ موہنجودڑو تہذیب کا عرصہ محور تین ہزار قبل از مسیح سے لے کر پندرہ سو قبل از مسیح ہے۔

شاکر علی صاحب بلاشبہ پاکستان میں جدید مصوری کے بانی ہیں وہ کیوب ازم کے توسط سے

ہماری مصوری کی جدیدیت کا سنگِ بنیاد تھے وہ ہر امیج اور پیکر کو مختصر سے مختصر تر طور پر دِکھلانا چاہتے تھے ان کی محبت اور شفقت ہی کچھ ایسی تھی کہ ان کے گرد ایک حلقہ از خود بن گیا جو لاہور گروپ آف آرٹ کہلایا جس کے نمائندہ مصوروں میں شمزہ، علی امام، شیخ صفدر اور معین نجمی تھے۔

زبیدہ آغا کو متفقہ طور پر ''فسٹ لیڈی آف آرٹ'' کہا گیا۔ ویسے امرتا شیر گل بھی ہمارے آرٹ کا اٹوٹ حصہ ہیں۔

لیلیٰ شہزاد موہنجودڑو اور گوتم بدھ (ٹیکسلا) کے بنیادی خیال کے لیے مشہور تھیں۔ ان کے فن کا قومی سطح پر تحفظ ضروری ہے۔

احمد پرویز کی تصویریں غیر تجسیمی ہوا کرتی تھیں یعنی تجریدی مگر جمال افروز پرویز کے رنگ خوبصورت، آبشار کی طرح کینوس پر گرا کرتے تھے۔

۱۹۴۳ء مشرقی پاکستان کا قحط ایک قہرِ الٰہی تھا۔ ایک مصور جو بے حد رومانیت پسند تھا، اس نے ایک بلیک اینڈ وائٹ اسکیچ بنایا جس کا عنوان تھا۔۔۔ میڈونا: ۱۹۴۳ء ایک روح فرسا اسکیچ، ایک ایسی میڈونا (یا ماں) جس کا بچہ اس کی چھاتیوں سے دُودھ تلاش کر رہا تھا اس مصور کا نام زین العابدین تھا (واضح رہے کہ اب تک صرف بنگالی زین العابدین کو ہمارے پاکستانی آرٹ کا حصہ تصور کیا جاتا ہے۔)

صادقین کی تصاویر دیوقامت مگر سنگ تراشیدہ ہوا کرتی تھیں، صادقین جلد ہی مغربی کیوب ازم (Cubism) کے دور سے نکل آئے پھر ان کا عنکبوتی دور (Cobweb) بے حد مقبول ہوا جس کا مفہوم یہ تھا کہ عام انسان ایک اعلیٰ آدرش کو اب تک پا نہیں سکا۔

صادق کی دیوقامت خطاطی اس کی جمالیاتی وجلالی قوت کا عجیب وغریب امتزاج ہے۔

خطاط، مصور، سنگ تراش، آذر زوبی ادب وفنونِ لطیفہ کو ایک مرکز پر دیکھنا چاہتے تھے۔ آذر زوبی نے ''شعور'' اور ''کائنات'' دو ادبی رسالے نکالے جن کی یاد بڑے بوڑھے قارئین کے دِلوں پر آج تک نقش ہے۔ آزر زوبی کے نسوانی ومردانہ پیکر صحت مندی، جواں خیزی اور حوصلے کے پیکر ہیں۔ ان کا مرقع علامہ اقبال (شکوہ جوابِ شکوہ) ایک معرکے کی چیز ہے، کاش کہ وہ شائع ہو جائے۔

صد افسوس! زوبی جنوبی ایشیا میں یونیورسٹی آف ڈیزائن کا خوب دیکھتے دیکھتے اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ گل جی کا آرٹسٹک سفر پورٹریٹ سازی سے شروع ہو کر فری ہینڈ خطاطی کے کمال تک جا پہنچا، وہ خود کو ''مصوری کا صوفی'' کہتے ہیں۔ اسٹائل اور تکنیک میں وہ امریکن تجریدی اظہاریت کے قریب ہیں۔ بے حد افسوس! گل جی بھی مرحوم ہو چکے۔

جمیل نقش کا محبوب موضوع ''عورت اور کبوتر'' رہا جو آج کے دورِ آشوب کے تناظر میں

امن و آشتی کا پیغام دیتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ جمیل نقش کی نقطیت (Pointillism) لاشعوری طور پر فرانسیسی مصور جورجز سورا کی یاد دلاتی ہے مگر جمیل نقش کی ہر تصویر، ہر خطاطی، ہر ڈرائنگ بے حد طبع زاد ہے۔ منصور راہی پابلو پکاسو کے کیوب ازم (Cubism) کا دیوانہ ہے۔ اس کی رُوح مشرقی بنگال کے لوک عناصر سے بنی ہوئی ہے۔

منصور اے ''چاند چہرہ اور ستارہ آنکھیں'' بنانے میں آج تک مصروف ہیں۔ زمانے کے دُکھوں نے منصور اے کی دوشیزہ کا چہرہ اب ''بے چہرہ'' کر دیا ہے۔

آفتاب ظفر ''اسکول آف رئیل ازم'' کی نمائندگی کرتے ہیں ''تحریکِ پاکستان'' ان کی ایک ایسی یادگار سیریز ہے۔ جو محمد بن قاسم کی آمد سے شروع ہو کر قائداعظم کے سنہرے الفاظ پر ختم ہوتی ہے۔

بشیر مرزا (مرحوم) کی فولیو آف پاکستان اور تنہا دوشیزہ Lonely Girl سیریز کی تخلیق شہرت پا چکی تھی۔ زندگی کے آخری حصے میں وہ عورت کا چہرہ، آسٹریلیا کا سورج اور درخت اپنی مصوری میں لے کر آیا۔ اسے عورت کی قربت ضرور حاصل ہوئی، مگر عورت کا پیار اسے نہ مل سکا۔

غلام رسول، مصباح قاضی، اعجاز الحسن، خالد اقبال اور ذوالقرنین حیدر ماڈرن ازم کے تناظر میں پنجاب کے لینڈ اسکیپ بہترین طور پر پیش کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔

خواتین و مصوروں میں سلیمہ ہاشمی، قدیر نثار، ناہید رضا، مہر وز افروز اور رفعت علوی پاکستانی مصوری کے حوالے سے قابلِ ذکر ہیں۔ مشکور رضا کیوب ازم بلکہ تجریدیت کے توسط سے ایک بڑا نام ہے۔ اس کے جیومیٹرک مربع اور مستطیل شفاف پہلودار رنگ بن کر ناظر کی نگاہوں کو خیرہ کر دیتے ہیں۔ تا حال عورت اور گھوڑے مشکور رضا کا محبوب موضوع ہے۔ گھوڑا دراصل یونانی دیومالا سے مستعار ہے مگر پاکستانی مصوری کے تناظر میں مشکور رضا کے بنائے ہوئے گھوڑے بے حد توانا تحرک کے ضامن ہیں۔

گزشتہ عشرے میں مصورانہ خطاطی بامِ عروج پر جا پہنچی۔ اس کی صدقِ دِل سے ابتدا کرنے والوں میں شاکر علی شمزہ، حنیف رامے، صادق اور آذر زوبی تھے۔ بعد میں اس قافلے میں احمد خان، اسلم کمال، موجِد، جمیل نقش اور مشکور رضا شامل ہوئے۔

عسکری میاں ایرانی کی خطاطی مغلیہ منی ایچر کی قدیم فضا میں رچی بسی بھلی معلوم ہوتی ہے۔ وہ خطاط جنھیں مصورانہ خطاطی کرنے کا کوئی دعویٰ نہیں مگر اِن کے خطاطانہ جوہر قابلِ ستائش ہیں۔ ان میں احمد مدنی، الخطاط عبدالرؤف، ابن وامق، استاد شفیع الزماں، زوار حسین، سرفراز مصور، ریاض رفیع، حنیف خان اور شکیل اسماعیل قابلِ ذکر ہیں۔ نوجوان خطاطوں میں محفوظ خان اور ایم کاشف خان ہیں

جو خاموشی اور لگن کے ساتھ خطاطی کر رہے ہیں۔

کراچی آؤٹ ڈور کرنے والوں میں غالب باقر، ذہین احمد (مرحوم) عبدالحیٔ، توفیق احمد، ڈاکٹر منظور الحسن اور مختار حیدر کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ مذکورہ مصورین واٹر کلر کے شیدائی ہیں۔

غالب باقر ساحل سمندر اور کشتیوں کا آؤٹ ڈور تقریباً ڈھائی عشروں سے کر رہے ہیں مگر ان دِنوں گوشہ نشین ہو کر اپنے منفرد اسٹائل کی تجریدیت کر رہے ہیں۔ غالب باقر بھی سرئیل ازم سے متاثر تھے۔ میرے خیال میں غالب باقر کی موجودہ تجریدیت نیچر کا لامحالہ حصہ ہے۔ یعنی تجرید کے پردے میں نیچر ہی نیچر۔

ذہین احمد (مرحوم) اس لیے ممتاز و منفرد ہو گئے کہ انھوں نے ڈرائی برش اسٹروک کو باکمال و بہ احسن پیش کیا۔ ذہین احمد کی بنائی ہوئی ٹھٹھہ سیریز حال سے مستقبل واٹر کلر تاریخ میں ایک لازوال سیریز بن گئی ہے جسے قومی سطح پر اب محفوظ کرنا ضروری ہو گیا ہے۔

عبدالحیٔ نے نیچر کو بے تحاشہ پینٹ کیا، والہانہ شوق سے کہیں بڑھ کر وہ کہتے ہیں ''میں نیچر کو اب جنون کی حد تک پینٹ کرنا چاہتا ہوں۔'' عبدالحیٔ ان دِنوں کراچی کی قدیم عمارات کو تصویر کرنا چاہتے ہیں جس سے یقیناً کراچی کا قدیم فنِ تعمیر محفوظ ہو جائے گا۔

کراچی آؤٹ ڈور مصوری اب ظفر محمود، غلام عباس کمان گر، لیاقت علی عاصم، محمد یوسف، طاہر پرویز اور عبدالمجید خاصخیلی بھی ذوق و شوق سے کام کر رہے ہیں۔

مصوری درحقیقت جمالیاتی ڈسپلن کا نام ہی نہیں رُوحانی ڈسپلن کا نام بھی ہے۔ اس ڈسپلن کو پانے کے لیے نیچر سے ہم آہنگ ہونا ضروری ہے۔

OOO

نظمیں

– آفتاب اقبال شمیم –

جھکے رہنا ضرورت بن گئی ہے

یہ بستی شہر بعدِ شہر
دہشت کے سفینوں کا سمندر بنتی جاتی ہے
دھماکہ۔۔۔ پھینک کر کھینچا ہوا
وہ جال ہے جس جال میں آ کر
بڑی مچھلی کا سایہ اور چھوٹی مچھلیوں کے جسم
ساحل پر بکھرتے ہیں
ذرا سی دیر مرگِ ناگہاں کا رقص کرتے ہیں
خبر کا گورکن
اعداد میں تبدیل ہوتی میّتوں کو دفن کرتا ہے
جنازوں کے تواتر میں اُسے وقفہ نہیں ملتا
کہ ستا لے
کوئی ناغہ نہیں ہوتا
اُٹھا کر ہاتھ اِن بے موت مرتی خلقتوں کی
فاتحہ پڑھنا
کئی برسوں کی عادت بن گئی ہے
تو کیا یہ دِن
زوال آثار پستی کے سفر میں ہیں!
جھکے رہنا، جھکے سر کی ضرورت بن گئی ہے

درمدحِ خواب

تصور کا روزن ہے جس سے میں
اپنے اِمکانات کی پھیلی وسعت کا
ادراک کروں
دِن کی دُنیاداری سے تر دامن کو
نیند سے جاگی روشنیوں سے
پاک کروں
میرا یہ بے صرفہ خواب غنیمت ہے
جو ایام کے ملبے سے
میرے اندر کے ناوقت تمدن کی
اسطور بناتا رہتا ہے
ہر مشکل میں جینے کا دستور بناتا رہتا ہے

میں بیک بنچر ہوں

میں بیک بنچر ہوں
آتے جاتے معلّموں، ہم جماعتوں کی نظر سے بچ کر
لگا ہوں اِک نظم کھینچنے میں
میں ایک تصویر لکھ رہا ہوں
نہ کوئی شاباش کی تمنا، نہ خودنمائی کی کوئی خواہش
نہ دفترِ روزِ چند میں درج ہونے والوں کے
ساتھ چھپنے کی کوئی حسرت
عجیب سا خبط ہو گیا ہے کہ نارسائی کے فاصلے سے
اُسے میں لمس و مشام، دید و شنید کی
قربتوں میں لاؤں
مجھے تو اب یاد بھی نہیں ہے؟ کہاں ملی تھی
وہ زندگی جیسی ایک لڑکی
میں جس کے رُخسار و چشم و لب کی
مِٹی مٹی سی شباہتیں،
اُن گلاب چہروں میں دیکھتا ہوں
مجھے جو اُس سامنے کے منظر میں
ایک آئینہ دار لمحہ دِکھا رہا ہے

آدرش

جب آدرش جواں ہوتا ہے
جذبے کی مہمان سرائے کثرت میں
رونق ہی رونق رہتی ہے
آتی جاتی شکلوں اور تمثالوں کی
سینے کی تازہ مٹی میں
کانٹا کانٹا قلمیں بو کر،
سیدھی قامت والوں کی
پہلے عشق کے موسم میں۔۔۔
آنکھ دھڑکنے لگتی ہے
ہر اِک گملا ایک چمن سا لگتا ہے
اور سفر کرتی سانسوں کے ساتھ صلیبیں چلتی ہیں
پھر یہ سپنوں والی شیشم خم کھا کر
عمر کے جاڑے میں آہستہ آہستہ
ارمانوں کی وہیل چیئر بن جاتی ہے

OOO

نظمیں

-احمد ہمیش-

سرِ وقت

کسی لامرکب کی تجسیم کیسی ہوسکتی ہے
سوائے اس کے کہ جسم لاجسم ہوجائے
ڈرو اُس وقت سے کہ بنا بیج ڈالے
اِس طرح اُگایا جائے گا
کہ اُگنے والا کبھی ظاہر نہیں ہوگا
آخر زن زر زمین
یہ تین ہی لفظ تو تھے
کہ جن سے ایک بے یقین دُنیا بنائی گئی
اب جب کہ میں خود ایک لا اندازہ اور
لاعلم انت کی کگار پر آ کھڑا ہوا ہوں
تو یہ کہہ سکتا ہوں کہ جاگ رہا ہوں یا سو رہا ہوں
یہاں تک کہ کسی کو آواز نہیں دے سکتا
شاید ہوا جاگ رہی ہے
باقی عالم نہ تو جاگتا نہ سوتا ہے
دروازہ نہ کھلا ہے نہ بند ہے
تو جہانِ جاں کی دھونکنی چل رہی ہے!
یہ کیا ہے کہ اَنت ہے اننت
پھر جنازہ کس کا اُٹھایا جا رہا ہے
میرا، تمھارا، اُس کا یا پورے عالم کا
ذرا سوچنا کہ پورے عالم کا جنازہ کس قبر تک
لے جایا جائے گا
ذرا سوچنا کہ
اس لامتناہی قبر میں مٹی ڈالنے والے آدم زاد
ہوں گے یا فرشتے!

بساطِ عدم

کسی کے لیے کچھ نہیں ہوتا
کچھ ہوتا بھی ہے تو وہ بھی نہیں ہوتا
شاید کسی زمانے میں
ایک انتہائی فضول لفظ محبت ہوا کرتا تھا
مگر اُسے مردہ پا کے
کوّے اور گدھ چٹ کر گئے
مگر اِس پر شیطان اتنا خوش ہوا
کہ اُس نے اپنی سلطنت میں ناچنا شروع کیا
تو آج تک مسلسل ناچ ہی رہا ہے
آئندہ بھی اسی طرح ناچتا ہی رہے گا
کیونکہ اب کوئی مور کی کلغی سر میں لگا کے
رقص کے متوالوں کو بے وقوف نہیں بنا سکتا

سریبرینیسا (Srebrenica)

(چالیس ہزار بوسنیائی مسلمانوں کا شہر جسے قابض سربوں نے چھوڑ دینے پر مجبور کر دیا)

-صفدر صدیق رضی-

تری کوئی سرحد مرے شہر کے عارض ولب پہ
لب ثبت کرتی نہیں
تیرا موسم مرے شہر کے موسموں کو بدلتے ہوئے
رنگ و آہنگ سے بے خبر ہے
کہ تجھ پر برستا ہوا اَبر پارہ
کسی اور سطحِ سمندر سے اُٹھتا ہوا مور کا پنکھ ہے
تجھ پہ جب صبح سورج نکلتا ہے
میرے یہاں شام کے ہاتھ
آرائشِ شب کا آغاز کرتے ہیں
تیرے حَسیں سبزہ و دشت پر اُڑنے والے پرندے
کبھی میرے پھیلے ہوئے بازوؤں کی طرف
محوِ پرواز ہوتے نہیں
تیری گلیاں
مری چاپ کے گھنگھروؤں کی صدا سے شناسا نہیں
تیرے دیوار و در
میری دستک کی رِم جھم سے نا آشنا ہیں
مرے ساحلوں کی ہوائیں
ترے بام و در تک پہنچنے سے پہلے ہی
دم توڑ جاتی ہیں
اور میرے سر پر
ترے پیڑ کی چھاؤں کا دستِ شفقت نہیں ہے
کہ ہم دونوں صدیوں سے
برعکس سمتوں میں آباد ہیں
یہ ترے میرے مابین سب فاصلے
ماورائے مسافت سہی
پھر بھی اے شہر سریبرنیسا
تیرے ہجرت زدہ قافلوں
اور تجھ سے بچھڑ جانے والے
گل اندام بچوں کے قدموں سے
لپٹی ہوئی دھول میں
میں بہر گام موجود ہوں

درختوں کے لیے ایک نظم

-فاضل جمیلی-

اے درختو! تمھیں جب کاٹ دیا جائے گا
اور تم سوکھ کے لکڑی میں بدل جاؤ گے
ایسے عالم میں بہت پیش کشیں ہوں گی تمھیں
تم مگر اپنی روایت سے نہ پھرنا ہرگز

شاہ کی کرسی میں ڈھلنے سے کہیں بہتر ہے
کسی فٹ پاتھ کے ہوٹل کا وہ ٹوٹا ہوا تختہ بننا
میلے کپڑوں میں سہی
لوگ محبت سے جہاں بیٹھتے ہیں

کسی بندوق کا دستہ بھی نہیں ہونا تمھیں
چاقو چھریوں کو بھی خدمات نہ اپنی دینا
ایسے دروازے کی چوکھٹ بھی نہ بننا ہرگز
جو محبت بھری دستک پہ کبھی کھل نہ سکے

اے درختو! تمھیں جب کاٹ دیا جائے گا
اور تم سوکھ کے لکڑی میں بدل جاؤ گے
کوئی بے ساکھی بنائے تو سہارا دینا
اور کشتی کے لیے اِتنی محبت سے تم آگے بڑھنا
کہ سمندر کی فراخی بھی بہت کم پڑ جائے

اپنے پتوار مرے بازوؤں جیسے رکھنا
جو کسی اور کی طاقت کے سوا زندہ ہیں
میری دُنیا کہ ابھی واقفِ اُلفت ہی نہیں
میرے بازو بھی محبت کے سوا زندہ ہیں

اے حسن کوزہ گر! تیرے بغداد میں

(ن م راشد کے نام)

—منصور آفاق—

یہ خذف ریزے مٹی کے یہ ٹھیکرے
نقشِ تہذیب کے کہنہ آثار ہیں
ہر طرف سرخ پانی کے سیلاب میں
تربتر ، ٹوٹے کوزوں کے انبار ہیں
اے حسن کوزہ گر! تیرے بغداد میں

تیری خاکِ نگاراں وہ تشکیل گہہ
موت کی گرد سے میلی میلی ہوئی
ٹوٹنے کی صدائے ستم ، ہر طرف
ایک آوازِ تخریب پھیلی ہوئی
اے حسن کوزہ گر! تیرے بغداد میں

کچھ صلیبیں در آئی ہیں محراب میں
مسجدوں میں دریچے کلیسا کے ہیں
آسمانوں میں میخوں سے ٹھونکے ہوئے
ہر طرف بت خدا زادِ عیسیٰ کے ہیں
اے حسن کوزہ گر! تیرے بغداد میں

صحنِ باغِ ارم کی ہیں راہداریاں
ہاتھیوں کے پڑاؤ سے ٹوٹی ہوئی
ہر طرف ہیں کھجوروں کے زخمی پرے
بستیاں ہیں مدینے کی لوٹی ہوئی
اے حسن کوزہ گر! تیرے بغداد میں

ہر قدم پر لہو کا تعاقب کرے
موت وحشت زدہ اُونٹنی کی طرح
چار اطراف میں زندگی کی تڑپ
جسم کی آخری جھرجھری کی طرح
اے حسن کوزہ گر! تیرے بغداد میں

نظم

–رامش منہاس–

یہ سر بریدہ جوان لاشے
کہ جن کے خوں سے چنار وادی مہک رہی ہے
کہ جن کے سینوں پہ
اپنی دھرتی کی آبرو کے ہزار تمغے سجے ہوئے ہیں
اور اُن کے جسموں پہ گولیوں کے نشاں ہیں، لیکن چمک رہے ہیں
چنار وادی کی بوڑھی ماؤں کی خشک آنکھوں میں
آنسوؤں کے تمام دریا اُتر گئے ہیں
وہ جانتی ہیں کہ جاگنا ہے
وہ جانتی ہیں کہ اُن کی بستی میں سونے والا کوئی نہیں ہے
جوان لاشوں پہ رونے والا کوئی نہیں ہے
چنار وادی کی دُلہنوں نے
سہاگ کے وہ تمام جوڑے جلا دِیئے ہیں
وہ جانتی ہیں غلام دھرتی پر دُلہنوں کا سہاگ کیسا!
شبِ سیہ میں چٹخنے والی یہ اَدھ کھلی سی اُداس کلیاں
یہ منتظر دُلہنوں کے آنچل
جوان لاشے۔۔۔ کٹے ہوئے سر

نئی سحر کے پیام بر ہیں
یہ نامہ بر ہیں
وطن کی آزاد ساعتوں کے
یہی نوید بہار دیں گے
یہی زمیں کو نکھار دیں گے

نظمیں

—ہارون عثمانی—

شبِ تنہائی میں

شبِ تنہائی میں
جب تیری یاد کے پھول کھلتے ہیں
تو تیری باتوں کی خوشبو
چارسو پھیل جاتی ہے
میری تنہائی کو مہکاتی ہے
اور تیری آنکھوں کی چمک
تیرے لہجے کی کھنک
تیرے چہرے کی دمک
خواب بن کر میری آنکھوں پر دستک دیتے ہیں
اور جب میں انھیں بلانے کے لیے
اپنی پلکوں کے کواڑ کھولتا ہوں
تو یہ خواب
کسی شریر بچے کی مانند
بھاگ جاتے ہیں
دُور کھڑے مسکراتے ہیں
اور کہتے ہیں
یہ ہم تو نہیں تھے

اَن کہی باتیں

دسمبر کی سرد راتوں میں
یوں ہی سرسری سی باتوں میں بیتے لمحے جو یاد آئیں
ادھوری ملاقاتیں کسک جگائیں
تو گزری باتوں کے ساتھ
اُن باتوں کو بھی دُہرالینا
جو اَن کہی رہ گئی تھیں
اَنا کے سیلاب میں بہہ گئی تھیں

میں کون ہوں

اِتنی بڑی ان دُنیاؤں میں
کائنات کی ان وسعتوں میں
ان خلاؤں میں
میں کون ہوں؟
میری پہچان کیا ہے؟
مجھے کون جانتا ہے؟
شاید دُنیا کے ساحلوں پر بکھری ریت کا ایک ذرّہ
پر ریت کون چھانتا ہے؟
تو پھر میں کون ہوں؟
مجھے کون جانتا ہے؟

نظمیں

-فوزیہ چودھری-

بے یقینی

مجھے یقیں ہے کہ تم بھی اپنی سراب راتوں میں
بے یقینی کی راکھ اُڑا کر
بدلتے لمحوں کی حیرتوں میں
جو کھو گئے ہو!——
مجھے یقیں ہے کہ تیرہ راتوں،
چراغ صبحوں کی راہگزر پر
کوئی تو ہے جو چراغ تھامے
اُمیدِ صبحِ بہار تھامے
دریدہ ذہنوں
پریدہ چہروں
اُداس آنکھوں سے تک رہا ہے
اُس آسماں کی مسافتوں کو
جو بے یقینی کی خاک میں اب اَٹی پڑی ہیں
مٹی پڑی ہیں
جو بے یقیں ہیں

بازدید

گمانِ لمس رفتہ کی
اگر پہچان ہے کچھ بھی
تو آنکلو مری جاں
تم اُنھی گم گشتہ رستوں پر
کہ جن کی جستجو اب تک
زیاں کی آبرو ٹھہری
چلے آؤ! جو فرصت ہو،
کسی دِن تم کو آنے کی
اُنھی سنسان راہوں، رائیگانی کے جزیروں میں
جہاں پر زندگی اب تک
بھٹکتی، ٹمٹماتی، روشنی کی منتظر بیٹھی
شکستہ پا، تھکی ہاری
تمھیں واپس بلاتی ہے
اُمیدوں، آرزوؤں کے کئی آنگن سجاتی ہے
چلے آؤ!
کسی دِن اِس طرف بھی
تم چلے آؤ!

ارتھ کوئیک ٹین ایٹ (2005)

—احمد شہباز خاور—

خدا میرے خدا! اے میرے خالق
اے میری زندگی اور موت کے مختار و مالک
میں تیری ساری مخلوقات میں اشرف
تری تقویمِ احسن ہوں
زمیں پر تیرا نائب ہوں
مگر اب ۔۔۔ جس زمیں کو تو نے یہ اعزاز بخشا
اس زمیں پر، لہو میں تر بتر بکھرا ہوا ہوں
کہیں آدھا بدن میرا کئی دِن سے
دبا رکھا ہے ملبے نے
بریدہ ہاتھ مجھ سے دُور کھائی میں پڑا ہے
کہیں کچلی ہوئی ہے ٹانگ میری
اور کہیں بکھرا ہوا ہے کاسۂ سر
کہیں وہ غم زدہ ماں ہوں
کہ جس کے زندہ رہنے کا کوئی مقصد نہیں باقی
کہیں وہ آنکھ ہوں جس میں غموں کی رات اُتری ہے
تلاش علم میں نکلا ہوا اک ایسا بچہ ہوں
جو مکتب سے ابھی تک گھر نہیں لوٹا

مری آنکھوں میں مایوسی کی مٹی بھر گئی ہے
اور ہر سو گھپ اندھیرا ہے
ہر اک جائے اماں مقتل بنی ہے
زمیں کی ایک جنبش سے
میں زیرِ آسماں یوں بے اماں ہوں
مرے ہر سو مرے پیاروں کے لاشے ہیں
کہ جن پر بین کرنے کو نہیں کوئی
مرے کانوں میں ملبے میں دبے
اپنوں کی آوازیں شرر بن کر اُترتی ہیں
مگر میں ہل نہیں سکتا، کہ پتھر ہو گیا ہوں
مدد کے واسطے ہلتا ہوا ملبے سے باہر وہ اکیلا ہاتھ ہوں
جس پر مرا خوں خشک ہو کر دھول مٹی ہو گیا ہے
کہیں اُجڑے گھروندے میں
بہت سی کرچیوں کی شکل میں ٹوٹا کھلونا ہوں
کہ جس سے کھیلنے والے کبھی واپس نہ آئیں گے
میرے کمزور کاندھے
میّتوں کو اِک جگہ پر لاتے لاتے تھک گئے ہیں
جہاں معصومیت کے قہقہوں کے پھول کھلتے تھے
وہاں اب موت کا تاریک سنّاٹا ڈراتا ہے
میں اِک ایسا مسافر ہوں
کہ انجانے میں جس کا قافلہ لوٹا گیا ہو
اور اب زادِ سفر میں
چند اشکوں، چند آہوں سسکیوں کی ریزگاری ہو
جو خِطّہ ایک لمحہ پیشتر سرسبز و شاداب اور دِلکش تھا
ہزاروں لوگ جس کی اِک جھلک سے شاد ہوتے تھے

وہاں اب خوف کا پہرہ ہے
اور زخموں نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں
میرے چاروں طرف بکھرے ہوئے اعضاء ہیں
زخمی چیختے چلاتے انسانوں کے نوحے ہیں
یا بے گور و کفن لاشیں ہیں اور ان کا تعفن ہے
زمیں کے غیظ پر، چشم فلک رونے لگی ہے
نہ اس کے اشک تھمتے ہیں
نہ غم کی رات کٹتی ہے
کئی بجھتی ہوئی آنکھیں،
خلاؤں سے پرے کب سے
کسی کھوئے ہوئے کو ڈھونڈتی ہیں
مگر اس کا نشاں ملتا نہیں ہے
مری خوشیوں کا دریا دُکھ کا صحرا ہو گیا ہے
یہ صحرا پھر سے بہتے زندگی کے گیت گاتے
گنگناتے سکھ کے دریا میں بدل دے
خدا میرے خدا، اے میرے خالق
اے میری زندگی اور موت کے مختار و مالک
مجھے ہمت عطا کر، حوصلہ دے
مری آنکھوں میں پھر سپنے سجا دے

نائس ٹو سی یو ڈاکٹر

–ڈاکٹر نگہت نسیم–

اوہ، میرے خدا یہ تم ہو
جیسی چھوڑ گیا تھا اب ویسی نہیں ہو
پہلے بھی تم حسین تھیں پر اب اور ہوگئی ہو
پہلے کی طرح اتنی ہی مہربان اور دلدار سی ہو
میں آج اپنے خدا سے بہت خوش ہوں ۔۔۔ بہت خوش ۔۔۔
اس نے آسمان کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا

اور
نم آنکھوں سے لرزتا ہوا سیدھا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا
''نائس ٹو سی یو ڈاکٹر''
میں نے حیرانگی سے اس کی فائل میں اپنے ہی لکھے لفظوں کو دیکھا
وہ بیمار ایک سال پہلے مجھ سے شفا مانگنے آیا تھا
کئی ضروری باتیں آج بھی ہو رہیں تھیں
جو یہاں رقم ہو رہیں تھیں
اس کا ملگجا سا لباس آج بھی شکن دار تھا
اس کی متورم آنکھیں آج بھی مغموم تھیں
سر سے پیر تک تنہائی کی تصویر لگ رہا تھا

پر کچھ تو تھا جو اِسے سب سے الگ کر رہا تھا
اوہ۔۔۔شاید اس کی باتیں
میں نے چونک کر اسے دیکھا جو مجھ سے کہہ رہا تھا
سنو!
مجھ سے وعدہ کرو
تم
گاڑی آہستہ چلاؤ گی
تم۔۔۔تم۔۔۔وہ اب لفظوں کی ترتیب ڈھونڈ رہا تھا
تم سب کچھ بھلا کر یونہی ہنستی رہو گی
وعدہ ڈاکٹر۔۔۔
پھر اس کا لرزتا سیدھا ہاتھ مجھ سے بچھڑ گیا تھا
مجھے یاد آیا۔۔۔
جب وہ پہلی بار مجھ سے مِلا تھا
اس دِن
میری آنکھیں بہت نم تھیں
میرا دِل بھی دھیرے دھیرے چلتا تھا
اور میں
سب کچھ بھول جانا چاہتی تھی
پر
میں نے تو ایسا کچھ بھی نہ کہا تھا۔۔۔
جو وہ مجھے اندر تک پڑھ گیا تھا
''نائس ٹو سی یو ڈاکٹر''
کہہ کر اپنا دستِ شفا یہیں چھوڑ گیا تھا

○○○

نظم

—ندا فاطمہ—

خارزدہ صحرا کی ریت پہ چلتے چلتے
لہولہان ہوئی ہوں کتنی بار
مگر پھر
مَیں نے اُجڑے گھر میں کتنے جتن کیے
اور کیسے کیسے پھول کھلائے
جانے والا چلا گیا تھا
مجھ کو ہوا کے دوش پہ تنہا چھوڑ گیا تھا
سارے رِشتے توڑ گیا تھا
کم ہمت تھے تم اور مَیں تھی اِک کمزور بدن
حالات سے لڑتی بھڑتی
زخمی ہوتی زخمی کرتی چلتی رہی
آج تمھیں احساس ہوا تم لوٹ آئے
پاگل آنکھوں کے سب سپنے جاگ اُٹھے ہیں
دیکھ رہی ہوں دروازے کی درزوں سے
پھول کھلے ہیں صحنِ چمن میں
خوشبوؤں سے باغ لدے ہیں
آج مری تکمیل ہوئی ہے
ایک نئی تشکیل ہوئی ہے

غولِ بیابانی

—منشا یاد—

تین روحیں اور دو قالب۔

ایک نے سامان کا اور دوسرے نے تیسرے کا بوجھ اٹھا رکھا تھا۔ خوابوں اور اندیشوں کا بوجھ برابر برابر تھا۔

راستہ تنگ، پُر پیچ اور ناہموار۔ خاردار جھاڑیاں دامن پکڑتیں، لمبی لمبی دُوب ٹانگوں کو چھپنے لگاتی اور کنکر پتھر پیروں کو لہولہان کرتے۔

وہ کھانے اور ستانے کے چھوٹے چھوٹے وقفوں کے ساتھ دن بھر چلتے رہتے اور رات پڑنے سے پہلے کسی چھوٹی یا بڑی آبادی تک پہنچنے کی کوشش کرتے۔ گھر اور وطن کی تاہنگ اور بچوں کے مل جانے کی موہوم سی امید کے علاوہ یہ امکان بھی ان کے ہم رکاب تھا کہ شاید ندی کے پل پر پہنچ کر کوئی سواری مل جائے۔

وہ برسوں بعد لوٹ رہے تھے۔

وہ بہت خوب صورت اور شاد و آباد بستی تھی۔ اسے دنیاوی بہشت سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ تین جانب سے پہاڑوں میں گھری ہوئی۔ کالے، سفید اور اودے بادل اس پر ہمہ وقت منڈلاتے رہتے، بادِ بہار کے جھونکے اٹھکیلیاں کرتے، شفاف برفاب ندیاں اور ٹھنڈے میٹھے پانی کے چشمے، گھنے اور سایہ دار اشجار، ہری بھری شاداب چراگاہیں، ڈھلوانوں پر بچھے سبزے کے قالین، سفید اون والی بھیڑیں، سنہری بالوں والے بھٹوں کے کھیت کھلیان، اناروں اور انار دانے کے بوٹوں پر مہکتی شنگرفی کلیاں، میووں سے لدی ڈالیاں، پھولوں کا طواف کرتی تتلیاں، خوشبو اور مٹھاس کی تلاش میں پھرتی مدھ مکھیاں، پیڑوں پر بولتی فاختائیں، گاتی ہوئی قمریاں، کوکتی ہوئی کوئلیں، نورانی صبحیں اور سنہری شامیں، راتوں کی

سیاہ چادروں پر کاڑھے گئے جگنوؤں کے پھول، باغوں میں چہچہاتے خوش الحان پرند، رقص کرتے ہوئے مور، شفاف پانی کی جھیلوں میں تیرتے ہوئے لمبی گردنوں والے آبی پرندے۔ چھوٹی چھوٹی سرخ اور پختہ اینٹوں سے بنائی گئی فلک بوس عمارات، ہیروں اور موتیوں کی طرح جگمگاتے فانوس، ساگوانی دروازے، کشادہ گلیاں، روشن کوچے۔ مدھر تانوں سے وقت کا اعلان کرتے گھڑیال، سنگِ مرمر کے حوضوں میں اچھلتے فوارے، رنگ برنگی پتنگیں اڑاتے بچے۔ سیاہ اور بادامی آنکھوں والی خوب صورت عورتیں، تھیٹروں اور کلبوں میں موسیقی اور رقص وسرود کی محفلیں اور ہر سو ہنستی مسکراتی زندگی۔

مگر ایک روز اچانک اس بہشت بستی میں ایک عجیب وغریب مخلوق گھس آئی تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے پوری بستی کو اپنے حصار میں لے لیا تھا۔

یہ بہار کی ایک خوشگوار صبح کا ذکر ہے۔ بستی میں چہل پہل تھی۔ لوگ حسبِ معمول اپنے اپنے کاموں میں مشغول تھے۔ صفائی اور دھلائی کے بعد دکانیں اور سٹورز کھل چکے تھے۔ شوکیسوں میں سامان سجایا جا چکا تھا۔ سنار، ٹھٹھیار، کمہار، بزاز اور بڑھئی سب اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو چکے تھے۔ ملیں اور مشینیں چلنے لگی تھیں اور چمنیوں سے دھواں نکلنے لگا تھا۔ سکولوں اور مدرسوں میں دعا کے بعد کلاسیں لگ چکی تھیں۔ کالجوں میں پہلا پیریڈ شروع ہو چکا تھا۔ جہاز اور بسیں اپنی اپنی منزلوں کو روانہ ہو چکے تھے یا روانگی کی تیاری کر رہے تھے۔ عمارتوں کی تعمیر میں مصروف مزدوروں نے اینٹوں کی ترائی کر لی تھی اور سیمنٹ کا مسالہ تیار کر لیا تھا اور راج مستری مچانوں پر چڑھ کر چنائی کرنے کی تیاری کر رہے تھے۔ انجینئروں نے پہاڑی سڑک کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے بارودی سرنگ کے فتیلے کو آگ لگوا دی گئی تھی جو آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی اور کسی کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ بستی کی پرسکون اور خوشگوار زندگی کا آخری پل ختم ہونے کو ہے۔

یوں تو بلاسٹنگ کئی روز سے جاری تھی مگر اس روز کا دھماکہ غیر معمولی تھا، جو دور دور تک سنا گیا۔ اس شدید دھماکے کے ساتھ بڑی بڑی چٹانیں ٹوٹ کر پتھروں، سنگ ریزوں اور غبار کی صورت دور دور تک پھیل گئیں۔ جنگلی جانور گھبرا کر ادھر ادھر بھاگنے لگے، حشرات الارض بلوں میں گھس گئے، خوف زدہ پرندوں نے درختوں کو غیر محفوظ جانا اور پھڑ پھڑا کر اُڑے اور فضا میں شور مچانے لگے۔ پہاڑ کی ایک بڑی چٹان ٹوٹی اور بہت سی دوسری چٹانوں کو اپنے ساتھ لیتی ہوئی نشیب میں جا گری۔ آہنی اوزاروں اور مشینوں کی مدد سے پتھر ہٹائے گئے تو ایک لمبی، گہری اور تاریک سرنگ نمودار ہوئی۔ بڑی بڑی ٹارچوں اور جنریٹروں کی مدد سے سرنگ کے اندر روشنی کی گئی مگر بجز اندھیرے اور پتھروں کے کچھ دکھائی نہ دیا لیکن جب اگلے روز دوبارہ کام شروع ہوا تو وہ ایک عجیب وغریب آدمی کو دیکھ کر ششدر رہ گئے

جو ابھی ابھی سرنگ سے برآمد ہوا تھا اور جسے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ اس کے ناخن اور جسم کے سارے بال بڑھے ہوئے تھے اور وہ آدمی سے زیادہ بھوت لگ رہا تھا۔ شاید وہ نابینا تھا یا طویل عرصہ تک تاریکی میں رہنے کے بعد اس کی آنکھیں چندھیا رہی تھیں، وہ دیکھتے ہی دیکھتے سرنگ میں واپس چلا گیا۔ یوں لگتا تھا جیسے پہاڑ کے اندر یا دوسری طرف بہت بڑے بڑے غار ہوں جن میں اس جیسی مخلوق رہتی ہو۔

انہیں اندازہ تھا کہ رات کے وقت وہ آدمی یا بھوت دوبارہ نمودار ہوگا۔ انہوں نے وہاں مسلح پہرے دار بٹھا دیے تاکہ اسے پکڑ کر تحقیق کی جا سکے کہ وہ کس قسم کی مخلوق تھی اور کیا وادی کے باشندوں کو اس سے کوئی خطرہ تو نہیں تھا۔ چونکہ یہ خبر ساری وادی میں پھیل گئی تھی اس لیے اگلے روز وہاں بستی کے بہت سے سرکردہ لوگ اور اخبار والے بھی جمع ہو گئے۔ مگر یہ جان کر سراسیمگی پھیل گئی کہ پہرے دار نہ صرف ہلاک ہو چکے تھے بلکہ ان کے جسموں سے گوشت نوچا اور لہو چاٹا گیا تھا جیسے انہیں رات بھر بہت سے بھوکے بھیڑیے بھنبھوڑتے رہے ہوں۔ بلاسٹنگ اور سڑک کی تعمیر کا کام ملتوی اور سرنگ کا منہ پتھروں سے بند کر دیا گیا مگر رات کو وادی کے مختلف حصوں میں ایسی وارداتیں ہوئیں جن کے بارے میں اس سے پہلے تصور تک نہ کیا جاتا تھا۔ رات کے وقت گھروں سے نکلنے یا باہر رہ جانے والے کئی ایک آدمی غائب یا ہلاک ہو گئے۔ ان کی ہڈیاں اور کھوپڑیاں جنگلوں اور غاروں سے ملیں۔ ایسا لگتا تھا کوئی آدم خور مخلوق وادی میں گھس آئی تھی۔ کھوجیوں کے اندازے کے مطابق ان کی تعداد بہت زیادہ تھی اور وہ گھنے جنگلوں، سرکنڈوں اور تاریک جگہوں پر چھپے ہوئے تھے یا پھر وارداتیں کر کے روشنی ہونے سے پہلے پہلے دوبارہ پہاڑ کی کھوہ میں چھپ گئے تھے۔ سرنگ کو دوباہ زیادہ مضبوطی سے بند کر دیا گیا اور مسلح پہریدار بھی بٹھا دیئے گئے مگر اگلی صبح جب زندہ بچ جانے والے پہرے داروں نے چیخ چیخ کر لوگوں کو خبردار کیا کہ خونخوار مخلوق پتھر ہٹا کر بڑی تعداد میں باہر نکل آئی تھی اور آبادی کا رخ کر لیا تھا، تو ہر طرف بھگدڑ مچ گئی۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ سرنگ سے ایک ایک کر کے نکلتے تھے مگر ان پر کوئی ہتھیار اثر نہ کرتا تھا۔ ان کے چہرے بالوں سے ڈھکے ہوئے تھے اور وہ ایک جیسے دکھائی دیتے تھے۔ وہ آدمیوں اور مویشیوں کو بھیڑیوں اور لگڑ بھگوں کی طرح گھیر لیتے اور ناخنوں اور دانتوں سے کھدیڑ ڈالتے۔ ان کے ناخن نوکیلے اور دانت عام انسانوں کے مقابلے میں زیادہ بڑے تھے اور ان کی آنکھیں رات کو شکاری درندوں کی طرح چمکتی تھیں۔

بستی کے مکینوں کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ بال بچوں کو لے کر فوراً بستی سے ہجرت کر جائیں اور نشیبی علاقوں کی نسبتاً محفوظ بستیوں میں پناہ گزین ہوں۔ سو انہوں نے ایک رات جب ان بدذاتوں نے بستی پر ہلہ بول دیا تھا گھر بار چھوڑا اور ضروری سامان اور بال بچوں کو لے کر فرار

ہونے لگے۔ اس بھگدڑ میں بہت سے بڑے بوڑھے اور بچے کچلے گئے یا پھر گم ہوگئے۔ شاد و آباد گھر ویران، گلیاں سنسان اور روشنیوں کی جگہ اندھیروں نے لے لی۔ اکا دکا آدمی جسے فرار کا موقع نہ مل سکا یا جسے کوئی محفوظ ٹھکانہ مل گیا تھا، پیچھے رہ گیا۔ مگر اسے بھی کچھ دنوں میں ہجرت کرنا ہی پڑی کہ پوری بستی پر ان بدبختوں کا قبضہ ہوگیا تھا۔ دن کے وقت ہجرت کرنا آسان تھا کہ انہیں روشنی میں کچھ دکھائی سجھائی نہ دیتا تھا۔

وہ دونوں بھی ان ہجرت کرنے والوں شامل تھے، جن کے بچے گم ہوگئے تھے۔ تب منّا تین اور منّی دو برس کی تھی۔ وہ انہیں ساتھ لے کر گھر سے نکلے تھے مگر بستی سے نکل کر روشنی میں دیکھا تو بچوں کو اپنے ہمراہ نہ پایا۔ وہ واپس جا کر انہیں تلاش کرتے رہے مگر ان کا کچھ سراغ نہ ملا۔ ایسا لگتا تھا انہیں کوئی آسیب اٹھا کرلے گیا۔ بعد میں آنے والوں نے بتایا تھا کہ آدمیوں سے خالی ہوجانے کے بعد بستی میں وہ وحشی اب راتوں کو عام دکھائی دینے لگے تھے۔ ان کی دست برد سے آدمی ہی نہیں جانور اور پرندے بھی محفوظ نہ تھے۔ وہ تھوڑے ہی عرصہ میں مرغوں، موروں، ہرنوں، گھوڑوں اور بیلوں کو چٹ کر گئے یا وہ بھی آدمیوں کی طرح بدحواس ہو کر وادی سے فرار ہوگئے۔

لیکن ایک عجیب بات یہ تھی کہ وہ جانوروں اور پرندوں میں بھی صرف خوب صورت، خوش الحان اور خوش رفتاروں کو ہی کھانا پسند کرتے۔ اس طرح کچھ ہی عرصہ میں خونخوار، نجس اور بدصورت سمجھے جانے والے جانوروں گدھوں، کتوں، ریچھوں، سوٴروں، چھپکلیوں، چھچھوندروں، گلہریوں، چوہوں، سانپوں، مینڈکوں، کچھووں، لال بیگوں، دیمک اور مکوڑوں کے سوا سارے جانور اور پرندے کھا لیے گئے یا وہ فرار ہوگئے۔ توتے، چڑیاں، مور، ہدہد، فاختائیں، شارکیں، بلبلیں، کوئلیں، تیتر، تلیر، بٹیر، بطخیں اور ہدہد نامعلوم سمتوں کو ہجرت کر گئے۔ ان کے کھائے جانے یا فرار ہوجانے سے چیلوں، کوّوں، گدّھوں، الووٴں، چمگادڑوں، جھینگروں، ٹڈوں، مکڑیوں اور بھڑوں کو پھلنے پھولنے اور بڑھنے کے لیے کشادہ جگہیں مل گئیں۔ کہا جاتا تھا کہ عورتوں کے ساتھ ان کا سلوک اتنا ناگوار تھا کہ وہ ان کے ساتھ رہنے پر خودکشی کو ترجیح دیتیں۔ اس لیے کچھ ہی عرصہ میں عورتوں سمیت بستی ہر خوب صورت چیز سے یکسر خالی ہوگئی۔

زیادہ تر لوگوں کا خیال تھا کہ بستی پر قابض ہونے والی مخلوق چنڈال اور بیتال تھے۔ چونکہ وہ دن کو وہ باہر نہیں آتے تھے اس لیے بعض دوسرے لوگ سمجھتے تھے وہ کسی تاریک سیارے سے آئے تھے۔ اور چوں کہ روشنی سے ان کی آنکھیں خیرہ ہوجاتی تھیں اس لیے ساری وارداتیں رات ہی کو ہوتیں اور دن کا وقت نسبتاً وارداتوں سے محفوظ رہتا۔ رات کو ہر طرف سایوں، ہیولوں اور بھوتوں کا راج ہوتا۔ کوئی شخص وادی میں داخل نہ ہوسکتا۔ آنے جانے کے تمام راستے مسدود ہوجاتے۔

بہشت بستی سے ہجرت کرنے والے اڑوس پڑوس کی بستیوں میں جا بسے تھے اور بہت عسرت اور غربت کی زندگی گزار رہے تھے۔ انہیں بستی کے آزاد اور پاک ہو جانے کی امید زندہ رکھے ہوئے تھی مگر طرح طرح کی افواہیں سن کر ان کے دل ڈوبنے لگتے۔ وسوسے اور اندیشے ہیبت ناک منظروں کی شکل دھار لیتے۔ سوتے جاگتے ہول ناک خواب دکھائی دیتے۔ ہلاک یا گم ہونے والے بچوں کی فکر سے والدین کو سونا اور کھانا پینا ناگوار ہو گیا۔

اسی حال میں زندگی گزارتے گزارتے جب کئی برس بیت گئے تو ایک روز نوید ملی کہ بستی ان بدذاتوں کے وجود سے پاک ہو گئی۔ یقیناً وہ خوراک کی کمی کا شکار ہو گئے تھے کہ وہ خود بجز شکار کے کوئی کام نہ کرتے تھے۔ وادی میں غالباً ان کے کھانے پینے کی کوئی چیز نہ بچی تو وہ واپس چلے گئے۔ لیکن بعض لوگوں کا خیال تھا کہ بستی میں عورتوں کی کمیابی ان کی واپسی کا سبب بنی۔ جوان عورتوں نے ان کے بچے جننے پر موت کو ترجیح دی تھی اور بوڑھی اور بانجھ عورتوں کو خود انہوں نے ٹھکانے لگا دیا تھا۔

بہرحال بستی اب اندھیروں سے نکل آئی تھی۔

اگرچہ راستے کھل گئے تھے مگر کسی کو اب بھی وہاں جانے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ کیا پتہ ان میں سے کچھ ابھی وہاں گھات لگائے بیٹھے ہوں اور ان کے بداثرات تو یقیناً ساری وادی میں موجود ہوں گے۔ پھر ہر روز نئی افواہ۔ وہ واپس آ رہے ہیں یا کچھ ہی دنوں میں لوٹ آئیں گے وغیرہ۔

مگر کسی کو تو پہل کرنا تھی سو وہ ان دونوں کے حصے میں آئی اور وہ سفر کی تیاری کرنے لگے۔ ہجرت سے پہلے ان کے دونوں بچوں کی ہڈیاں اور کھوپڑیاں ملی تھیں نہ ہی کوئی پتہ نشانی۔ اس لیے وہ ایک موہوم سی امید کے سہارے زندگی گزار رہے تھے کہ شاید ان کے گم شدہ بچے یا کم سے کم بیٹا تو یقیناً مل ہی جائے گا۔

ان کے ہم وطنوں نے مشورہ دیا ابھی کچھ روز اور انتظار کرنا چاہئے۔ مگر بچوں کے بارے میں دیکھے ہوئے ایک تازہ خواب نے انہیں بے چین کر رکھا تھا۔

زیادہ تر خواب اسے ہی آتے تھے اور زیادہ تر سچے ہوتے تھے۔ خوابوں میں بچوں کی چیخ پکار اسے اکثر سنائی دیتی رہتی تھی۔ خدا جانے وہ کس حال میں تھے؟ تھے بھی یا نہیں! اب اس نے پھر پہلے جیسا ہول ناک خواب دیکھا اور آدھی رات کو اٹھ کر زاری کرنے لگی تھی۔

اس نے تسلی دی ''ضروری نہیں ہر خواب سچا ہو''

''تم پوچھو گے نہیں، میں نے کیا دیکھا؟''

''پوچھ کر کیا کرنا ہے۔ کہہ تو رہی ہو پہلے جیسا ہی ڈراؤنا تھا۔ بری باتوں کو دہرانے سے

کیا حاصل؟''

''تم اندازہ نہیں لگا سکتے کہ کتنا ڈراؤنا تھا؟''

''ڈرتا ہوں۔کہیں ذرا سا بھی سچ نکل آیا تو!''

''لیکن مجھ اکیلی سے یہ برداشت نہیں ہورہا''

''تم تو بڑی بہادر بنتی ہو،ایک خواب کا بوجھ نہیں اٹھا سکتیں؟''

''تم بانٹ کیوں نہیں لیتے''

''بھاگوں والی۔سر پر اٹھانے والا بوجھ ہوتا تو میں تمہارے حصے کا بھی اٹھا لیتا مگر یہ تو خواب ہے جو سن بھی لیا تو بانٹا نہ جا سکے گا''

''شاید میرا ہول ہلکا ہو جائے۔''

وہ خواب کی بات ٹالنا چاہتا تھا۔اس کا خیال تھا، دو ایک روز میں وہ خود ہی بھول جائے گی یا خواب کی ہولناکی کم پڑ جائے گی۔لیکن ایسا نہ ہو سکا اور اسے خواب کا بوجھ بانٹنا ہی پڑا۔اس کا خواب سن کر وہ خود بھی دہل گیا تھا۔ایک زیرِ زمین قید خانے میں، ڈربوں میں بند مرغیوں کی طرح، بہت سے چھوٹے بڑے، بھوکے پیاسے بچے بلک رہے تھے۔آدم خور دروازہ کھول کر اندر آتے اور ان میں سے چند ایک کو پکڑنے کی کوشش کرتے تو وہ خوف سے ادھر ادھر بھاگتے اور ایک دوسرے کے پیچھے چھپنے کی ناکام کوشش کرتے۔پھر بالوں بھرے لمبے لمبے ہاتھ انہیں اپنی گرفت میں لے لیتے اور وہ انہیں گھسیٹتے ہوئے لے جاتے۔قید خانے کا دروازہ دوبارہ بند ہو جاتا۔پھر اسے مکروہ صورت آدمی چھریوں سے بچوں کی کھالیں اتارتے اور قصابوں کی طرح بوٹیاں چیرتے دکھائی دیے۔ان بچوں میں اس کی اپنی منی اور ننھا بھی شامل تھے اور جن کے گلے کاٹے جا رہے تھے۔وہ چیخ مار کر بیدار ہو گئی تھی۔

اس کا خواب سن کر وہ بھی دہشت زدہ ہو گیا مگر اس نے دل کڑا کر کے تشفی دی''خواب جھوٹ ہوتے ہیں اور ان کی تعبیر اُلٹی۔''

''اللہ کرے ایسا ہی ہو۔''

سفر پر روانہ ہونے سے ایک روز پہلے اس نے کوشش کی تھی، اس کے اور سامان کے لیے ایک گدھا خرید لے مگر اس نے منع کر دیا تھا۔

''سارے پیسے اس پر خرچ کر ڈالو گے تو بچوں کے لیے کیا بچے گا؟''

''تم اس حالت میں کیسے سفر کرو گی؟ کاش میں تمہارے لیے کوئی بہتر سواری خرید سکتا۔''اس نے کہا تھا''لیکن جب ہم نے ہجرت کی تھی وہاں کسی خوب صورت جانور کی گنجائش نہیں تھی کیا پتہ اب

بھی نہ ہو۔''

''تم فکر نہ کرو۔ میں پیدل سفر کرسکتی ہوں ورنہ راستے میں ضرور کوئی سواری مل جائے گی۔''

وہ سانپ کی طرح بل کھاتی اس پہاڑی ندی تک بڑی دشواری کے بعد پہنچے تھے مگر وہاں پہنچ کر دور دور تک آتی جاتی کوئی سواری نظر نہ آتی تھی۔ وہ اس ندی کو پہچانتے تھے، پانی کے بہاؤ کی مخالف سمت میں چلنے لگے۔

پھر دشوار پہاڑی راستہ شروع ہوگیا۔ چڑھائی زیادہ مشکل، راستہ مزید سنگلاخ اور جنگل ناقابل عبور۔ حالانکہ اس نے پہلے روز ہی اس کے خواب کا بوجھ بانٹ لیا تھا مگر وہ جلدی تھکنے لگی تھی۔ اب لمحہ بہ لمحہ یہ سفر اب اور بھی دوبھر ہوتا جارہا تھا۔ خوابوں اور وسوسوں نے عملی شکل اختیار کرلی تھی۔ وہ وضو کرنے کے لیے ندی پر گیا تو اسے پانی کا رنگ کچھ بدلا بدلا سا دکھائی دیا۔ جیسے اوپر کہیں ندی کے کنارے بہت سی بھیڑیں ذبح کی گئی ہوں یا پہاڑوں پر سرخ رنگ کی بارش ہوئی ہو۔ اس نے ہاتھوں کے پیالے میں پانی لے کر اسے غور سے دیکھا اور سونگھا تو اسے عجیب سی بو آئی۔ پھر اس نے گدّھوں کو منڈلاتے اور گیدڑوں کو ہڈیاں تلاش کرتے ہوئے دیکھا تو اس کے اوسان خطا ہوگئے۔ مگر اس نے خود پر قابو پایا اور اس سے چھپایا، کہیں وہ ہول کے مارے وہیں ڈھیر نہ ہوجائے۔

اب منزل زیادہ دور نہ تھی مگر وہ بہت تھک چکی تھی اور اسے بخار بھی ہورہا تھا۔

تھک ہار کر وہ کسی سواری کے انتظار میں بیٹھ گئے۔

شام ہونے کو تھی۔

وہ مایوس ہو چلے تھے کہ اچانک ایک گدھا گاڑی کہیں سے نمودار ہوئی اور خود بخود ان کے پاس آکر رک گئی۔ یوں لگتا تھا جیسے غیب سے ان ہی کی مدد کو بھیجی گئی ہو۔ لیکن نوجوان گاڑی بان کا حلیہ عجیب سا تھا اور پتہ نہیں اس نے کس جانور کی کھال پہن رکھی تھی۔ کہیں وہ انہی میں سے نہ ہو، اس خیال سے وہ دہل سے گئے مگر اس کے چہرے اور جسم پر زیادہ بال نہیں تھے اور وہ ایک عام سا انسان لگتا تھا۔ اس نے ہاتھ سے انہیں پچھلی جانب جہاں چھوٹی بڑی کھالوں کا ڈھیر پڑا تھا، سوار ہونے کا اشارہ کیا۔

وہ سامان سمیت سوار ہوگئے تو گاڑی دوبارہ روانہ ہوئی مگر گاڑی بان برابر خاموش رہا۔ اسے ایک عجیب سا خیال آیا۔ ان کا منا بھی تو اب اتنا بڑا ضرور ہوگیا ہوگا؟

اس خیال سے کہ کہیں سچ مچ وہ ان کا منا ہی نہ ہو، اس نے مامتا بھرے لہجے میں پوچھا:

''بیٹا تمہارا نام کیا ہے؟'' مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ جیسے سنا ہی نہ ہو

''ہمیں اپنے بیٹے شاہد اور بیٹی ملاحت کی تلاش ہے'' وہ بولی۔

وہ اب بھی خاموش رہا تو وہ روہانسی ہو کر بولی ''یہ بولتا کیوں نہیں، مجھے اس سے ڈر لگنے لگا ہے۔''

''کیا پتہ اسے اذن نہ ہو یا ہماری تمہاری بولی نہ جانتا ہو''

''اسے کیسے پتہ ہماری بولی کیا ہے؟''

''لباس اور حلیے سے اندازہ ہو جاتا ہے۔''

دیکھنے میں وہ انہی جیسا عام سا آدمی معلوم ہوتا تھا مگر اس کے چہرے پر ایسی سختی تھی کہ بات کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔

''شاید ہوتا تو ضرور ہمیں پہچان لیتا، نہیں تو ہماری زبان تو ضرور ہی سمجھ لیتا''

''کیا معلوم سفاک لوگوں کے درمیان رہتے رہتے سب کچھ بھول گیا ہو یا اس کی زبان کاٹ دی گئی ہو۔''

گاڑی بان نے پلٹ کر قہر آلود نظروں سے انہیں دیکھا۔ وہ دبک سے گئے۔

پتہ نہیں وہ کس قماش کا آدمی ہو اور انہیں کہاں اتارے دے۔ اس نے سوچا مگر پھر اسے خیال آیا وہ یقیناً اتنا خطرناک شخص نہ ہوگا، ورنہ اتنی ہمدردی کیوں کرتا۔ اس نے تو کرائے بھاڑے کی بات بھی نہ کی تھی۔ اور وہ انہیں جہاں بھی اتارے گا، وہ جگہ اس ویرانے سے تو بہتر ہی ہوگی۔

گرمی کا موسم تھا مگر بخار کی وجہ سے اسے سردی لگ رہی تھی۔ اس نے کھالوں کے ڈھیر سے ایک تہہ کی ہوئی کھال اٹھائی اور اسے اوڑھا دی۔

''کسی ریچھ کی معلوم ہوتی ہے۔''

''پہن لو، تمہیں سردی نہیں لگے گی۔''

وہ تھکے ہوئے تھے بالوں بھری کھالوں کے ڈھیر پر بیٹھتے ہی نیند کے جھونکے آنے لگے اور انہیں پتہ ہی نہ چلا کہ کب رات کا اندھیرا پھیل گیا۔

اچانک وہ ایک ساتھ ہڑبڑا کر چونکے۔

گاڑی بان تحکمانہ انداز میں جو انسانی ہمدردی اور مروت سے عاری تھا، انہیں فوراً اتر جانے کا اشارہ کر رہا تھا۔

وہ گھبرا کر ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔

ایک طرف پہاڑ اور گھنا جنگل، دوسری جانب پتھروں سے سر ٹکرا ٹکرا کر راستہ بناتی ندی اور ہر سو گھپ اندھیرا۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ بے درد انہیں ایسی جگہ اتار دے گا۔ لیکن جونہی وہ سامان سمیت اترے۔ گاڑی، گدھا اور گاڑی بان تینوں نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

وہ ٹھٹک گئے۔

''یہ سب کیا تھا؟''

''اَسرار''

''اَسرار؟''

''وہ غیبی مدد نہیں تھی، چھلاوا تھا۔غولِ بیابانی''

''لیکن اس نے ہماری مدد کی''

''پتہ نہیں مدد کی یا راستے سے بھٹکا دیا''

''کیوں''

''یہ بد بخت ایسا ہی کرتے ہیں، ہمیں محتاط رہنا ہوگا''

''کیا وہ دوبارہ بھی آسکتے ہیں؟''

''ہوسکتا ہے، کسی اور روپ میں۔''

''مجھے ڈر لگ رہا ہے۔''

ڈرو نہیں، یہ مسافروں کو ایسے ہی ڈراتے، دل لگی کرتے اور راستے سے بھٹکاتے ہیں۔''

''کہیں ہم بھٹک تو نہیں گئے؟''

''مجھے لگتا ہے ہم وہیں کے وہیں کھڑے ہیں۔''

''اور وہ جو سفر طے کیا تھا؟''

''رائیگاں''

''اب کیا ہوگا؟''

''ڈرو نہیں میں ہوں نا تمہارے ساتھ۔ارے تم اس ریچھ کو بھی ساتھ ہی لے آئیں؟''

''اوہ میں اتارنا بھول گئی۔پھینک دوں؟''

''نہیں اوڑھے رکھو، تمہیں بخار ہے''

جن درختوں پر فاختائیں بولتی اور کوئلیں کوکتی تھیں وہاں اب کوے کائیں کائیں کرتے اور چمگادڑیں جھولے جھولتی تھیں۔

جن باغوں میں کبھی مور رقص کرتے تھے وہاں اب خار پُشت ناچتے تھے۔جن پارکوں میں خوب صورت اور خوش لباس بچے گھومتے تھے، وہاں اب کتے بھونک رہے تھے۔رقص وسرود کی محفلوں کی جگہ اب الو بولتے۔بستی ویران ہوچکی تھی اور پوری وادی ایک خرابے میں تبدیل ہوگئی تھی۔

بادل اب اور گہرے ہوگئے تھے جس کی وجہ سے تاریکی میں بھی مزید اضافہ ہوگیا تھا۔ اندھیرا اس قدر تھا کہ بند اور کھلی آنکھوں میں کچھ فرق معلوم نہ ہوتا تھا۔ یوں بھی شاید اماوس کی رات تھی۔ پھر ایسی آہٹیں اور سرسراہٹیں سنائی دینے لگیں جیسے ان کے آس پاس چمگادڑیں اڑتی، مینڈک پھدکتے اور سانپ سرسراتے ہوں۔ وہ سڑک سے ہٹ کر ایک بڑے درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ بجلی چمکی تو انہیں درخت کی ٹہنیوں پر اَن گنت چمگادڑیں الٹی لٹکی دکھائی دیں۔

''یہ الٹا کیوں لٹکتی ہیں''

''یہ اپنے لٹکنے کو سیدھا اور دوسروں کو الٹا سمجھتی ہیں۔''اس نے جواب دیا۔

اچانک قریبی درخت سے پرندوں کی پھڑ پھڑاہٹیں اور چیخ پکار سنائی دی۔

''یہ کیا ہورہا ہے؟''

''شاید کسی الّو نے پرندوں پر شب خون مارا۔ وہ بھی چمگاڈروں کی طرح اندھیرے میں دیکھ سکتے ہیں۔''

پھر اردگرد سے سرگوشیاں اور آوازیں سنائی دینے لگیں۔

'' پکڑو پکڑو، مارو مارو، کاٹ دو، چیر دو، بھون ڈالو، کھال کھینچ دو۔''

'' یہ سب اَسرار ہے۔ ان آوازوں سے ڈرنا نہیں؟''

''کون سی آوازیں؟''

''چلو اچھا ہے تمہیں سنائی نہیں دے رہیں۔''

''میں اندر والے کی آواز سن رہی ہوں۔''

''ہاں اب وہی ہماری آخری امید ہے۔ تم بے فکری سے سو جاؤ۔ میں جاگتا اور پہرہ دیتا رہوں گا۔''

جواب میں وہ خاموش رہی تو اس نے چھو کر دیکھا، اس کا بخار تیز ہوگیا تھا۔

اس نے سامان کھول کر چادر نکالی اور اس پر ڈال دی اور اجالے کا انتظار کرنے لگا۔

بیٹھے بیٹھے اسے پہلے انسانی جوڑے کا خیال آیا۔ کبھی وہ بھی اسی طرح اندھیرے میں شب باشی کرتے ہوں گے۔ شیاطین مختلف شکلیں دھار کر انہیں کبھی ڈراتے اور کبھی ان سے ٹھٹھا کرتے ہوں گے۔ جنگلی جانور اور آفات انہیں مٹانے کی کوشش کرتی ہوں گی۔ مگر انہوں نے ہمت نہ ہاری اور زندگی کا سفر جاری رکھا۔

پھر وہ چونک کر بیدار ہوگیا۔

دیکھا تو چار سو روشنی پھیلی ہوئی تھی۔اس نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی اور متعجب ہوا یہ تو وہی جگہ تھی جہاں وہ گزشتہ شام کو گدھا گاڑی میں سوار ہوئے تھے۔اس نے گھبرا کر اسے جھنجھوڑا مگر وہ ریچھ کی کھال اوڑھے اور درخت سے ٹیک لگائے کبھی نہ کھلنے والی نیند سو رہی تھی۔شاید اس نے پھر پہلے جیسا کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا تھا مگر اس بار اس کا بوجھ نہ سہار سکی تھی۔

OOO

یا شاعر

-طاہرہ اقبال-

''پیاری طالب علمو! میرے اس کتاب گھر میں بجز کتابوں کے کوئی ساماں نہیں۔ یہاں ہر علم کی ہر شاخ حرف، حرف پھولوں سے لدی ہے۔ ہر نوع ہر رنگ و باس کے کتب پھول کھلے ہیں۔ اپنی پسند کے شگوفے چن لیجیے اور اُن پر تشریف رکھیے۔ انہیں اپنے لمس مشکبار سے محروم مت کیجیے۔''

طالب علم لڑکیاں مرعوبیت وممنونیت کے بحرِ بے کراں میں ڈوب چلیں، کنارے کنارے بیچ منجدھار اتھاہ ساگر۔

کتابوں کے بندھے بنڈل جن کی بوباس مثل بند کلی اُنہی کا مقدر تھی۔ چہار جانب نشستوں کی مانند بکھرے تھے۔ لڑکیاں ایک ایک بنڈل پر سمٹ گئیں۔ یہ حرف پھول جن میں بدن پھول مہکتے ہیں۔ بدن پھول جو اپنی بوباس لٹا مرجھا جاتے ہیں۔ حرف پھول جو بدن مہک جذب کر کے سدا مشکبار رہتے ہیں۔ شاعر با کمال حرفوں کی تھالی تھامے عطر لوبان دھنکائے مشک مہکائے، مورتیوں کے چرنوں میں دوزانو ہو بیٹھا۔ حرفوں کی تھالی ہولے ہولے گردش کرنے لگی۔

''عزیز از جاں متعلّم مہرلقا! لال جلد والی افسانوی ادب کی کتاب تیرے تخیل کے رومان پرور جزیروں کی مدہوش کن فضاؤں کی غماز ہے۔ نغمۂ جان ترنم! تیرا حسن انتخاب تیرے خدوخالِ متوازن کا عجب سنگم ہے۔ تو سراپا گیت ہے مجسم نغمہ ہے۔ راگ راگنیوں کے علم پر محیط یہ کتاب تیرے ذوق ترنم آفریں کی غماز ہے۔ ماہ طلعت! تیری نگہ شیرانی ومجاز کے کلیات کو شرف انتخاب بخش گئی۔ تجھ میں عذرا و سلمیٰ کی ساری دلربایاں مجسم ہیں تو شاعر کے تخیل کی تجسیم ہے۔'' شاعر باکمال کی نیم وا آنکھوں میں نظاروں کی حشر سامانیاں گندھ گئی تھیں۔ چور چور چھلکتی اُمڈتی۔

دھند کے غباروں میں کوہ کے چناروں میں

برق کوند جاتی ہے حسن کے نظاروں میں!

''اے حسینۂ غنچہ دہن! میری اگلی کتاب کا انتساب تیرے نام کہ تو اس کتاب کے ہر ہر حرف میں ہر خیال میں لہو کی گردشِ تیز ہے۔'' تو کہ شاعر حرماں نصیب کے تخیل کی مہمیز ہے۔لڑکیاں مرعوبیت کے اتھاہ سمندر میں غوطہ زن سطحِ آب پر اُبھرتی ڈوبتی رہیں، سورج دن اور رات کی درمیانی فصیل پہ بجھا حاضر غائب نہ پورا اُجالا نہ پورا اندھیرا۔شاعر باکمال کا کتاب گھر ڈوبتے سورج کی شفق میں ملگجا، نکھرا کچھ واضح، کچھ دھندلا، کچھ ظاہر، کچھ پوشیدہ عارضوں کی شفق، لبوں کی دھنک، گیسوئے تابدار کی ملگجاہٹ، حرفوں کی مدھرتا، لہجوں کا ترنم شعروں کا رسیلا سحر۔

''پیاری طالبِ علمو! ہر غزل کا ہر شعر ہر اقتباس کا ہر لفظ ابلاغ معنی میں کمال ایمائیت رکھتا ہے۔''

''یا شاعر وضاحت ہو۔''

گدرائی ہوئی شفق کی کرنیں کُتری ہوئی دھنک پھووا پھووا۔شاعر باکمال کے وجود میں جھرجھری بڑھ کر پھیل گئی اور پھیل کر سمٹ گئی۔

''اچھی طالبِ علمو! ایک ہی شعر کی شرح ایک مردِ ثقیل کے لیے، نوجوانِ پُرجوش کے لیے یا دوشیزہ ہوشربا کے لیے معنی کی مختلف پرتیں کھولتی ہے۔

''یا شاعر مثال دی جائے۔''

''پیاری طالبِ علمو! تشریح وہ جواز خود دل کے نہاں خانوں میں شرح ہو جائے غالبِ خرابات کا مصرع ہے:

ع کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

نوجوان، ناشکیب کے جذب وکیف پر یہ کچھ یوں عیاں ہوتا ہے کہ جذبے کی تڑپ اور نگہ کی حدت پیراہن کے تاروپود کو جھلسا کر بھسم کر دیتی ہے۔سراپا غزل شعرِ مجسم دوشیزہ خوش جمال کا پیرہن مانند ورق مہین ہے کہ شباب ہوشربا مانندِ سوز برق سنگین ہے۔''

لڑکیاں اپنے اپنے وجود میں کسمسائیں، دہکتے انگاروں پر ہلکے ہلکے سرد چھینٹے تڑمڑا اٹھے اور بجھے۔پور پور ٹھنڈک پور پور حدت۔منتر دم حرف جل کی ست رنگی پھوار میں اشنان لیتی ہوئیں۔

''یا شاعر ہم طبیعتِ موزوں رکھتی ہیں، چند اشعار موزوں نگہ اصلاح کے طلب گار ہیں۔''

''اے دوشیزہ خوش جمال! تو خود شعر موزوں کی مثال بے مثال ہے۔شعر حسن تخیل ہے۔

تو منبع تخیل۔ شعرِ موزوں کو زبان شیریں کی شیرینی سے تر کر کہ سماعتوں میں قند گھل جائے۔'' نو آموز شاعرہ نے شعر پڑھا:

یاد نوحے سناتی رہی رات بھر
چشم نم ڈبڈباتی رہی رات بھر

''آہ۔ واہ۔ کراہ'' شاعر باکمال کی نگاہ سحرناک دوشیزہ خوش جمال کو شعر کے نازک نشیب و فراز سمجھانے لگی۔ ''شعری محاکات کی بلاغت واہ! داستان ہجر و فراق آہ کراہ عجب تمثیل ہے! کوزے میں دریا بند ہے۔''

''چشم آہو میں اشک تابدار، لرزتا، اُمڈتا۔ واہ! آہ! کراہ! تیرا تکلم خوش ادا تیرا تغزل سحر البیان، تو خوبصورت شاعرہ نہیں ساحرہ ہے۔'' خوبصورت شاعرہ گلنار ہو گئی۔ سارے دھنک رنگ روم روم گل رنگ ہو بکھر گئے۔

''یا شاعر! آپ شاعرِ باکمال ہیں، اَدب کے ستون ہیں۔ آپ کی جانب سے تعریف و تحسین گویا سند کامیابی ہے۔ منتر دم حرف جل کی پھوار بڑھ چلی۔''

''اے دوشیزہ گل بدن! جہاں میں تجھے دیکھتا ہوں میری پرواز شوخ کے پر جلتے ہیں۔ اقلیم شاعری میں تیرا ورود کسی تاجدار شہزادی کی مثل ہے۔ ناقدان ادب اپنی ہیچ مقدار انگلیاں قلم کر ڈالیں گے لیکن تیرے فن کی اتھاہ آنے والے ناقدین کی غواصی کے واسطے چھوڑنے پر مجبور ہوں گے۔ میری زیرِ طبع کتاب کا انتساب تیرے نام۔'' حرف جل میں ڈوبتی اُبھرتی جل پریاں ہفت رنگ پر پھڑ پھڑاتی سمیٹتی، رنگ پہنتی خوشبو اوڑھتی، منتر جل پھوار میں اشنان لیتیں۔

''یا شاعر! ایم۔ اے کے تھیسس کے چند صفحات قلم بند کیے ہیں۔ شام ملگجے دھندلکے میں پناہ لے چکی ہے۔ کل کلاس میں پیش نظر کر دیا جائے گا۔'' ''اے متعلّم ارسطو صفت! کلاس میں نوجوانان نازیبا اور ناموزوں طبع ایسے کار معقول میں دخل در معقولات کرتے ہیں۔ اسی کاروبار شوق کے واسطے یہ گوشہ علمی یہ گوشہ جمال مختص ہے۔''

''اے حسینہ خوش اندام! تیرا پنجۂ نازک بارِ قلم کا متحمل نہ ہو پائے گا یہ بار گراں تو میرے دست ناتواں پر چھوڑ دے۔ غالب عیش پسند نے ایسے ہی کسی موقع پر کہا تھا۔

فکر دنیا میں سر کھپاتا ہوں
مَیں کہاں اور یہ وبال کہاں

''یا شاعر غالب کی زمیں میں طبع آزمائی کی ہے۔'' لبوں کی بجلیاں تڑپیں رنگوں کی برکھا رُت گھنگھور ہو برسی۔

عشق ہی کارساز ہے ورنہ — میں کہاں اور یہ کمال کہاں
خودکلامی کا ہو نہ عالم تو — یہ جواب اور یہ سوال کہاں

''واہ! آہ! کراہ!'' ہر ہر حرف شاعر باکمال پر ایک وجد انگیز کرب طاری کرتا چلا گیا۔

چاند کیا شے ہے سامنے تیرے — تو کہاں اور یہ مثال کہاں
جس سے حقِ سخن ادا ہوتا — وہ میسر ہمیں مجال کہاں
دشتِ دِل کو خبر نہ ہو پائی — بھر گیا چوکڑی غزال کہاں

شاعر باکمال دوزانو ہو بیٹھے۔ حرفوں کی تھالی تھامے جوں پجاری بیٹھا ہو، دائرے میں بچھی کتابی نشستیں تھالی کی گردش میں گھومتی تھیں۔ گول گول اڑن طشتری۔

''پیاری طالبِ علمو! حسن مطلق نے اظہار چاہا تو انسان کامل کو اپنا عاشق بنا خود کو جہاں تہاں کچھ پوشیدہ کچھ ظاہر کر دیا۔ دھرتی کی کوکھ میں دفن بیج کو ظاہر کی بے قراری نمو بخش گئی۔ کلی کی چٹک پھول کی بیداری ہے۔ شاعر بے قرار کی طلب حسن کی آبیاری ہے۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

حسن سے تکمیل عشق عشق سے تکمیل حسن
اک کمی تیرے بغیر اک کمی میرے بغیر!!!

نیلگوں اندھیرا آفتاب کی نقاب ہو گیا برکھارت کا سینہ بوجھل تھا کھل کر برسا، رتیں بدلتی رہیں، کتاب گھر کی کتابیں بڑھتی رہیں۔ نشستیں جامد تھیں نشستگاں تبدیل ہوتے رہے۔ پارسل گیم کا کھیل، میوزک بجتا رہا، سازندہ ایک تھا۔ Pied Piper جادوگر سا! یہ نشستیں اپنی خوش طلعی پر کیوں نہ ناز کریں۔ پچھلے کتنے عشروں سے اَن گنت مہر لقائیں، ماہ طلعتیں، اپنے لمس مشکبار سے انہیں مہکاتی رہی ہیں۔ کسی دھائی کی سیاہ نقابوں میں چھپی، کبھی سفید چادروں میں ڈھکی، ڈھیلے ڈھالے ملبوسات چست لباسوں میں بدلتے رہے۔ چست لباس ڈھیلے ڈھالے ملبوسات میں تبدیل ہوتے رہے۔ سحرالبیان کے بحرِ رواں میں بے سمت بے مقام تیرتی ہوئیں۔ حرف جل کی ہفت رنگ پھوار میں بھیگ جاتیں۔ سمندری جھاگ کے کہرے میں نظر دھندلاتی ہوئی۔ ڈولتا ہوا بجرا کچھ تہہ آب کچھ سطح آب، حرف جل میں تیرتی جل پریاں۔

باہر صدائے نامانوس و ناگوار سحر زدہ ماحول میں سنگ ریزے برسا گئی۔ کتب گھر کے دَر سے

چند سراَندر لپکے، جن کے روئے سیاہ پر نظر پڑتے ہی شاعر باکمال کے چہرے پر ناگواری لیپ ہوگئی۔

''شاعر صاحب! ذرا مردانے میں تشریف لایئے۔'' طنز کے سارے تیر حرف جل کو ہدف کر گئے۔ لفظوں کی گردش کرتی تھالی ٹھہر گئی۔

''دوشیزگان خوش جمال! اگر طبع نازک پر گراں نہ گزرے تو مردان ناتراشیدہ کے تکلم ناموزوں سے سمع خراشی کرلوں۔'' باہر شور بڑھتا جارہا تھا۔ ''جھوٹا، مکار، فریبی، دھوکے باز۔'' لڑکیاں اپنے اپنے وجودوں میں کسمسائیں۔ جیسے پہلوؤں میں چیونٹیاں سی رینگ جائیں۔

''دوشیزگان خوش جمال! یہ آدم زادنہیں تصور وتخیل کے تازیانے ہیں۔ تربیت ناموزوں انہیں درشت خصلت بناگئی ہے۔ ان کے نامناسب رویے کے لیے حضورِ حسن منت خواہ ہوں کہ لاعلمی کا جہل انہیں گناہ کبیرہ کا مرتکب بنارہا ہے۔''

''تم ان احمق لڑکیوں کو بے وقوف بناسکتے ہو۔ ہمیں نہیں، باہر نکلو ورنہ باہر نکال لیے جاؤ گے۔'' حرفوں کی سنگ باری بڑی شدید تھی۔

شاعر باکمال لڑھکتے پتھر کی مانند دَر سے باہر پھسلے۔

''اے مردان ناتراشیدہ! مجھ شاعر ناچیز سے کس شئے کی طلب ہے جس کی سلطنت تخیلات کا گہوارہ ہے، جس کا سرمایہ الفاظ کا گنجینہ ہے۔''

''تو پھر یہ اَندر سبھا کیوں سجا رکھی ہے۔'' زبانوں کے لٹھ اوپر تلے برسے۔

''اے احمقو! یہی تو تخیلات کے گہوارے کی پریاں ہیں۔ یہی گنجینۂ الفاظ کی معانی ہیں۔ یہی تو اقلیم شاعری کے عمال ہیں۔''

''لڑکیو! گھروں کو چلی جاؤ۔ ورنہ آگ لگادی جائے گی۔ تم سمیت سب کچھ بھسم ہوجائے گا۔''

''مارو۔۔۔مارو۔۔۔بھسم کردو۔۔۔آگ لگادو شور سماعتوں کو کند کرنے لگا۔''

''یہ قحبہ خانہ ہے اسے ڈھادو۔ یہ کار ثواب ہے۔ بدعت کا خاتمہ کردو۔''

شور گراں سماعت تھا۔

''اے کم ظرفو! مجھے سولی پر لٹکا دو۔ فتویٰ لگادو لیکن اپنی زبانوں کو غلیظ مت کرو۔ زبان کہ غلیظ ہوجائے تو کوئی آب مطاہر اسے باوضو نہیں کرتا۔ نطق کی غلاظت زبان کی دبازت میں رَچ رَچ رَستی ہے۔ انگ انگ نجس کردیتی ہے۔ جیسے زمین کے سینے سے سیم رس رس اُسے بنجر بنادیتی ہے۔''

لڑکیاں ایک دوسرے میں چھپتی۔ جسموں کی گھڑیوں میں بندھی زینوں سے یکبارگی لڑھکیں۔

حرف جل کی جل پریاں، حرف پاتال میں غرق ہوگئیں۔

''اے مردانِ ناتراشیدہ! مانو کہ تمہاری حسِ لطافت عالم گراں خوابی میں ہے۔ مانو کہ اس گراں خوابی کی سزا جمالی بےحسی کی صورت میں تمہیں ملنے والی ہے، جب حسن رُوٹھ جاتا ہے تو بدصورتیوں کا دیوروح ونظر کو نگل جاتا ہے۔'' سڑک پر ٹائر جلتے تھے۔ جلے رَبڑ کی بو سارے بازار میں پھیلی تھی۔ دکانوں کے شٹر گرا دیئے گئے تھے۔ جلوس منتشر ہو چکا تھا لیکن چند نوجوان طالب علم ابھی جلتے ٹائروں پر ایندھن پھینک رہے تھے اور نعرے بازی کر رہے تھے۔

''اندرسبھا کو بند کرو بہروپیئے شاعر کو سنگسار کرو۔ یہ عالم نہیں علم کی بےحرمتی ہے۔''

نعرے کتاب گھر کی خاموش جلدوں سے ٹکراتے تھے اور پلٹتے تھے۔

کتابوں کے منتشر بنڈل کتنے خالی خالی تھے۔ سارے حرف سارے معنی گم، روشنائی کے دھبے خندہ زن۔

مفاہیم کے چراغ گل۔ شاعر باکمال دوزانو بیٹھا تھا۔ گل چراغوں کی راکھ پورے کتاب گھر میں اڑتی اور سانسوں میں جمتی تھی۔

''اس پر مہرلقا بیٹھی تھی۔ آہ پیاری مہرلقا! کیا تو اب کبھی نہ آئے گی! تیرا لمسِ مشکبار بےخبر حرفوں کو کیا کبھی خودشناسی نہ بخشے گا۔ کیا یہ حرف بےمعنی بےہیئت ہو جائیں گے۔ اس پر نغمہ نغز گو جلوہ افروز ہوتی تھی۔ اے نغمہ جاں! تمہاری صدا میری گویائی ہے۔ تمہارے لفظ میری سماعت، بولو کہ میری گویائی، میری سماعت میری حسیات سب پتھر ہیں۔

اے مرے!
زندگی کے زمستانِ یخ بار میں
قصرِ افکار کے حرف ہیں منجمد
اے مرے!
وقت کے گھور سینے کے اس گلخنِ یخ کو تُو
کوئی دم اپنی اِن شعلہ زا اُنگلیوں سے کُریدتے تو پھر
جملہ سنگین لفظوں کی سنگینیاں
موسم لاوہ بنیں!
منجمد برف میں ڈھلتے جاتے ہوئے حرف

تیری تمازت بھری سانس کی دھوپ سے
رُوح کی ظلمتوں میں اُتر کر
مراسم کی اِس کارگاہِ وفا میں
امرِ وصل کے چاند روشن کریں!
اے مرے!
جو مرے اور ترے درمیاں
ہچکچاہٹ کی نادیدہ دیوارِ آہن تنی ہے
گر یہ نادیدہ دیوارِ آہن گرے۔۔۔تو کہیں
تو کہیں نارسائی کی حامل فصیلوں کے اُس پار کی
ساعتِ لطف کو
دِل کے حاجت دیاروں میں
کھلتے گلابوں کا عنوان پانے کا ادراک ہو!
آرزوؤں کے اِس کرۂ منجمد پہ ترے
آتشیں لمسِ حاصل کی آسودگی
خاصۂ عہدِ حاضر کا اعزاز حاصل کرے!
رَخشِ عمرِ رواں کو ذرا اپنی باگوں کے کھینچنے کا احساس ہو!
حبسِ ظلمات میں
خیر کی دائمی سانس لیتی ہوئی نقرئی روشنی دسترس میں رہے!
اے مرے!

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

شاعر باکمال گھٹنے زمین پہ ٹیکے ناراض دیویوں کے چرنوں میں جھکا تھا۔ آخر وہ کیا دان کر ڈالے کہ روٹھی دیویاں مان جائیں۔ حرفوں کے چراغ گل تھے۔ معانی کے جزیرے برفاب۔ حرفوں کی تھالی خاموش۔

''گل رُخ تو ہی بول۔ نغمہ نغز گو تو کیوں چپ ہے تیری خاموشی اقلیمِ حرف کی توہین ہے۔

تمہارے لب۔ تیرے لب لعلیں پہ پھیلی مسکان شعری سانچوں کی ہفت قوسیں ہیں۔ تیرے ملیح عارض کتنی ردیفوں، کتنے قافیوں میں گندھے ہیں۔ تیرے گیسوئے تابعدار کتنی ترکیبیں ساخت کرتے ہیں تو سراپا غزل ہے جو بزبانِ شاعر گنگناہٹ بن جاتی ہے۔

تو بولتی کیوں نہیں۔ مہرلقا تو بھی نہیں بولتی، تو جو اِس شاعر حرماں نصیب کے تخیل کا منبع ہے۔ تصور کی شیریں کلامی ہے تو بھی نہیں بولتی۔''

شاعر باکمال کی آنکھوں سے جھلکتی وحشت نیچے سڑک پر جلتی آگ میں منعکس ہوتی تھی۔

مہرلقا کی نشست سینے سے بھینچی تھی۔

''بول مہرلقا بول۔ بول دے ورنہ۔۔۔ نہیں بولتی۔''

''ہاں تو اَب کبھی نہ بولے گی۔ کبھی نہ بولے گی۔'' مہرلقا کی نشست کھڑکی سے نکلی اور قلابازیاں کھاتی ہوئی ٹائروں کی آگ میں بھڑک اُٹھی، پھر طوفان سا برپا ہو گیا۔

ماہ طلعت، نغمۂ جاں، گل رُخ، ساری کی ساری ایک دوسرے کے پیچھے لڑھکتی چلی آئیں۔

روشنائی پگھل گئی۔ حرف جل اُٹھے چہرے بجھ گئے حرفوں کی چتا بھڑک رہی تھی۔

''اب کوئی نہ بولے گا۔ کبھی کوئی نہ بولے گا۔''

''ٹھہرو۔ ابھی ٹھہرو۔ تم یوں تنہا نہ گنگ ہو جاؤ گی۔'' شاعرِ باکمال کے سارے دیوان پررومان کھڑکی سے اوندھے منہ گرے اور بھڑک کو قیامت خیز بنا گئے۔

''دیکھا۔ دیکھا تم نے مہرلقا! ماہ طلعت! نغمہ جان! تم نے دیکھا۔ تمھارے سنگ شاعرِ باکمال بھی جلتا ہے۔ دیکھو کہ اس کی بھڑک دیدنی ہے۔ دیکھو کہ یہ تماشا پھر نہ دیکھا جائے گا۔''

ساری نشستیں سارے مسودے بہم بھڑک رہے تھے۔ نہ جانے کوسا شعلہ نشست سے اُٹھتا تھا اور کونسا مسودے کی لپک تھا۔

شاعرِ باکمال کھڑکی میں کھڑا اس بےنظیر آتش زدگی کا نظارہ کرتا تھا۔ سرکس کے فنکار کی مانند جس کے پورے وجود پر آگ کا لپکا چڑھا ہو اور نیچے بہت نیچے پاتال جل میں چھلانگ لگانے کو جسم تو تلا ہو۔ نیچے کھڑا مجمع چیخ رہا تھا۔

شاعر پاگل ہو گیا
شاعر پاگل ہو گیا

ooo

چاچا خیر، خیریت

—خالد محمود خان—

''بھین پہاڑی! خیر، خیریت ہے۔ چھوٹی رات کو آرام سے سوئی؟ فجر کی اذان کے لیے جا رہا ہوں۔نور کا تڑکا، بڑی برکت۔''

اندھیرے میں دیوار سے اُترتی آواز صحن میں پہاڑی اوراس کی تین بڑی بیٹیوں کی رُوح کو چُھوکر دیوار سے واپس لوٹ گئی۔ دو چار لمحے کھڑپ کھڑپ کی آواز آئی۔اتنی دیر میں چاچا کہیں دُور نکل گیا تھا۔ پہاڑی اور اس کی بڑی بیٹیاں، وضو، نماز، جھاڑو، صفائی اور بستر لپیٹنے میں لگ گئیں۔چھوٹی ابھی سو رہی تھی۔ چاچا اسے چھوٹی ہی کہتا تھا حالانکہ وہ کافی بڑی ہو چکی تھی۔ وہ بڑی بیٹیوں کو ''سیانیاں'' یعنی عقل مند کہتا تھا۔ان کے نام نہ لیتا تھا۔اس کے خیال میں دُنیا میں پیدا ہونے والی ہر بیٹی سیانی تھی۔ پاک، پوتر، ان کی ماں پہاڑی کی طرح۔ اگرچہ پہاڑی اب بہت بوڑھی ہو چکی تھی اور وہ سَر نکالتی بھرپور جوانیاں۔

پہاڑی، چوہڑی، کالی، منگتی اوران سے ملتے جلتے نام اُس گاؤں کی عورتوں کے لیے اجنبی نہ تھے۔مگر اب یہ گاؤں کافی عرصہ سے آہستہ آہستہ قصبہ بنتا جا رہا تھا۔لوگ وہی تھے یا شاید کچھ اور آباد ہو گئے ہوں اور کچھ گاؤں چھوڑ کہیں اور جا چکے ہوں گے۔مگر اس سے کوئی فرق نہ پڑتا تھا۔لوگ جس طرح گاؤں میں خوش، غم زدہ، مرتے یا جیتے تھے، اسی طرح اب قصبے میں بھی۔عورتوں کے علاوہ مردوں کے نام بھی روڑا، رُلدو، کاکا، کالا اور باگھڑا رکھ دیئے جاتے تھے۔ان کے ناموں میں کسی کے لیے ذلت یا تحقیر یا رسوائی نہ تھی بلکہ قبولیت تھی۔ نہ پکارنے والوں کو ناموں کے معنی میں کسی قسم کی اُلجھن نہ پکارے جانے والوں کو۔ رنگ، ذات پات، اُونچ نیچ، مقام، مرتبہ، عزت اور ذلت کی تخصیص ناموں ہی سے کی جاتی تھی۔معاشرتی طبقات کی تخصیص کے لیے اچھے اور بُرے نام معاشرے کے اجازت نامہ کی طرح

تھے۔کوئی عقیل، شکیل، کوئی رذیل وذلیل سب کے اپنے اپنے نام۔ معاشرتی امتیاز کا آسان ترین نسخہ۔ پہاڑی بھی انھی میں سے ایک تھی، لمبی چوڑی۔

دیوقامت عورت، بڑے بڑے ہاتھ، چوڑے چوڑے پیر، پھیلی ہوئی چوکور کلائیاں اوران پر بھاری بھرکم پٹھے اوران پراس کے بازوؤں کا لٹکا ہوا گوشت۔ یہ سب ایسے لگتا تھا جیسے کسی نے موٹی موٹی چوکور لکڑیوں پر پیتل کے پترے چڑھا دیئے ہوں۔اس کا شوہر دو بیٹوں اور تین بیٹیوں کی پیدایش کے بعد فوت ہوا۔ چوتھی بیٹی بعد میں پیدا ہوئی۔ چھوٹی کوئی نو دس برس کی ہوگی۔مگر وہ پہاڑی کی بیٹی تھی۔ مرمر کی چٹان، گلابی دھاریوں والی صفا سفید یا شاید رنگوں سے سجی موم کی گڑیا۔قریب کھیتوں سے پہاڑی چارہ کاٹتی اور گانٹھوں کو اکیلی اُٹھا لیتی۔اسے اپنے شوہر یا کسی اور کی مدد کی ضرورت نہ تھی۔کسی وزنی چیز کو اُٹھانا، رکھنا، توڑنا یا بنانا، پہاڑی کے لیے معمول کی بات تھی۔ وہ جتنی بڑی اور طاقت ور تھی اتنی ہی ٹھنڈی بھی۔ پہاڑ کی طرح بُردبار۔لوگ اس کی اس خوبی کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ جوانی اور بڑھاپے میں پہاڑ سے صبر والی۔ ہمیشہ کی طرح۔

چاچے کے قدموں کی کھڑپ کھڑپ پھر سے فضا میں پھیل گئی۔ہمسائے گھر میں اس کی آواز اُتری ''استاد خیر خیریت ہے۔استاد شکر دین''

''ہاں ہاں چاچا۔آجا۔چائے چل رہی ہے۔حُقہ بھی گرم ہے۔اندر آجا'' صحن میں سے کسی نے جواب دیا۔

''آتا ہوں۔ذرا چھوٹی کو دیکھ آؤں۔بخار آرہا تھا اسے کل سے۔''

''بھین پہاڑی! چھوٹی کا بخار اُترا؟'' دیوار پر سے آواز آنگن میں اُتری۔اب کافی روشنی تھی۔دیوار پر ایک لمبی گردن ڈھلکی۔اس پر چاچے کے لمبے لمبے بالوں کے پٹے نمایاں دِکھائی دے رہے تھے۔سر پر ایک پٹی سی بندھی تھی۔اس کا ماتھا درمیان سے کسی تکون کے کنارے کی طرح اُبھرا ہوا تھا۔لمبی ناک کے اُوپر چھوٹی چھوٹی آنکھیں۔ناک سے نیچے، ہونٹوں کے درمیان لمبے لمبے دانت۔مگر یہ اس کے منہ سے باہر نکلے نہ رہتے تھے۔البتہ بات کرتے ہوئے کافی ظاہر ہوجاتے۔خاص طور سے جب وہ مسکراتا۔ایسے میں لمبے لمبے دانتوں کا ظہور کوئی خاص پیغام دیتا تھا۔اس کے دانتوں پر پیلاہٹ بھی نظر آتی تھی۔رُخسار اُبھرے ہوئے بغیر گوشت کے بیضوی، بلکہ ذرا لمبوترا چہرہ، ڈاڑھی پہ ختم ہوجاتا تھا۔نوک دار لمبی ڈاڑھی، ذراسی حرکت یا ہوا سے اِدھر اُدھر جھولتی ہوئی۔لانبا قد، نہایت دُبلی اور اس سے بھی زیادہ لچک دار جسامت۔کپڑے کم قیمت اور پرانے ہونے کے باوجود تھوڑے بہت صاف ہی دِکھائی پڑتے تھے۔ جوتوں کی اس کے پاؤں سے کوئی مناسبت ضروری نہ تھی۔ یہی کافی کہ ان سے

کھڑپ کھڑپ کی آواز برآمد ہوتی تھی۔ وہ سارے قصبے کا ہر وقت طواف کرتا رہتا تھا۔ لوگوں کو اس کی موجودگی کی خبر رہتی تھی۔ کسی نہ کسی دروازے یا دیوار پر سے گردن صحن میں ڈھلک جاتی اور آواز آتی ''خیر خیر یت ہے؟'' اور پھر کھڑپ کھڑپ کہیں اور چلی جاتی۔ اس کے علاوہ اس کے ٹیپ ریکارڈر پر اکثر پٹھانے خان کی آواز گونجتی۔ یہ اسے پہاڑی کے بڑے بیٹے نے سعودی عرب سے بھیجا تھا۔ قرآن پاک اور نعت سننے اور سنانے کے لیے۔ چاچے نے اس میں شاہ حسین، بلھے شاہ، بابا فرید، سلطان باہو اور خواجہ فرید کی کافیاں اور کلام بھی شامل کر لیا۔ وہ اپنے دو چار کیسٹ اور پرانا سا ٹوٹا پھوٹا مگر آواز سے معمور ٹیپ ریکارڈر کپڑے کے ایک تھیلے میں رکھتا تھا۔ یہ اَن سِلا کپڑا اس کے پہلو میں تھیلے کی طرح تھا۔ اُوپر کندھے پر اس کی گرہیں تھیں، مگر یہ کسی بھکاری کی زنبیل، تھیلا یا کشکول نہ تھا۔ وہ کسی اور قسم کی دولت سے بھرا ہوا تھا۔ مگر پہاڑی کا وہ بیٹا سعودی عرب سے عرصہ ہوا نہ آیا تھا۔ جب آخری مرتبہ آیا تو بہنوں کی شادیوں کی بات کرنا چاہتا تھا۔ بہنوں سے ہنس ہنس کر باتیں کرتا تھا اور دبے دبے لفظوں میں ان کی مرضی دریافت کرنے کی کوشش کرتا۔ لڑکیوں کی ہنسی میں چاندی چھن چھناتی تھی۔ مگر یہ سب اس کے چھوٹے بھائی طاقت علی کو بہت بُرا لگتا تھا۔ اس نے بھائی کی بہت توہین کی اور بے غیرت بھی کہا۔ کبھی کبھار اس کے خطوط بھی سیانیوں کے نام آتے تھے۔ اس نے وہیں کہیں شادی بھی کر لی تھی اور اب ایک بیٹے کا باپ تھا۔ پہاڑی اپنے پوتے کو دیکھنے کے لیے حج کی بڑی آرزو کرتی۔ سیانیاں بھی۔

''چھوٹی! خیر خیر یت ہے؟'' چاچے نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ پہاڑی اور سیانیاں بھی چھوٹی کے اِردگرد چاچے کے ساتھ کھڑی تھیں۔ اس کی صدا پر فطرت نے آہستہ آہستہ آنکھ کھولی۔ چھوٹی کی آنکھوں سے سارا گھر منور ہو گیا۔ اس کے تکیے پر اس کے نیم گھنگھریالے بال بکھرے ہوئے تھے اور درمیان میں سنہری صفا سفید گلابی سا چہرہ۔ ایسے لگتا تھا جیسے بہت سے اژدھے کسی سونے کے خزانے کی حفاظت کر رہے ہوں۔ چاچے نے اس کے بال سمیٹ کر کانوں کے قریب کیے۔

''خیر خیر یت ہے۔ بس خیر خیر یت ہے۔'' وہ یہ کہتے ہوئے چل دیا اور استاد شکر دین کے گھر داخل ہو گیا۔ اس کے چلے جانے کے باوجود گھر کے در و دیوار پہ کسی گہرے اطمینان کا راج تھا، جیسے پہاڑی اور اس کی بیٹیوں کے چہروں پر چھوٹی کے تکیے پر آنکھیں کھولتی ہوئی فطرت کی آنکھوں میں۔ مگر طاقت علی کچھ جُز بُز تھا۔ وہ صحن میں ایک طرف بیٹھا اپنے ہاتھوں سے لوہے کی سلاخوں کو ایک خاص انداز میں ٹیڑھا کرتا رہا۔ اس کے ماتھے کی شکنوں میں بھی کوئی ایسا ہی ٹیڑھا پن تھا۔ وہ لوہے کا کام کرتا تھا۔ اس کا قد اگرچہ کافی چھوٹا تھا، مگر ہڈیاں چوڑی اور ان پر طاقت ور پٹھے، پیتل کے پتروں کی طرح نظر آتے تھے۔

''چاچا تو کہاں کہاں پھرتا رہتا ہے۔ کس کس وقت کس کس سے مِل لیتا ہے، لے چائے۔''

استاد شکر دین بولتا رہا" کیا کیا باتیں کر لیتا ہے۔ تیرا کس کس سے کیا رشتہ ہے۔ لے چائے کے ساتھ رس کھا لے۔ پتہ نہیں کچھ کھاتے بھی ہو کہ نہیں۔ خیر تم جیسے آدمی کو کوئی کیوں بھوک سے مرنے دے گا۔ یہ لے اور اس کو کھا لے۔ پہلے تو پراٹھے ہوتے تھے۔ بنائے، کھائے اور کھلائے جاتے تھے۔ اب گاؤں، گاؤں نہ رہا۔ قصبہ ہے اور شہر ہوتا جا رہا ہے۔"

"ہاں استاد" چاچے نے دو ہی گھونٹ میں سُر سُر کرتے ہوئے چائے کی ڈِیک لگائی اور رس نگل کر حُقّہ کی نَے اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔

"جہاں بندے رہتے ہیں وہ کوئی نہ کوئی تبدیلی تو کرتے ہیں۔ اسی طرح گاؤں بس گئے اور قصبے آباد۔ پہلے پراٹھے بنائے، کھائے، کھلائے جاتے تھے اب رس یا ڈبل روٹی۔ مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ استاد جی۔ اصل بات بندوں کی ہے۔ اصل بات رشتوں کی ہے۔ کوئی محسوس کرے تو یہ ہوتے ہیں ورنہ نہیں۔ کوئی بھتیجا نہ سہی بھانجا ہی سمجھ لیں۔ نام تبدیل ہو جاتے ہیں مگر اصل بات تو اصل رہتی ہے۔ آپ نے پراٹھا نہ کھلایا رس ہی سہی۔ بات تو ایک ہی ہے۔" چاچے نے دھوئیں کا ایک دبیز مرغولہ چھوڑتے ہوئے کہا۔

"چاچا جب تو میرے پاس پڑھتا تھا تو بہت نالائق تھا۔ تجھے نہ کتاب، نہ تختی پسند تھی۔ بس کہیں نہ کہیں بھاگ جانے میں ماہر تھا۔ تو اب بھی ایسا ہی ہے۔ مگر باتیں کتنی سیانی کرتے ہو۔ تم ایک لفظ بھی نہ پڑھے۔ ایک جماعت بھی نہ پڑھے۔ باتیں بڑی سیانی کرتے ہو۔ چلو میرے شاگرد تو ہو۔ تمہارا استاد تو کہلاتا ہوں۔" استاد شکر دین نے حُقّے کی نَے اپنی طرف کھینچتے ہوئے لمبا کش لگایا اور بات کو جاری رکھا۔

"چاچا کوئی بات سنا۔ تو سب کا رشتہ دار کیسے ہے۔ ہر کوئی تیرا رشتہ دار کیسے ہے۔ تیرا تو آگے پیچھے ہے ہی کوئی نہیں۔"

"نہیں نہیں استاد۔ ایسا نہیں۔"

چاچے نے اپنی زنبیل میں ہاتھ ڈالا۔ ہلکی سی کڑک کی آواز برآمد ہوئی اور پھر اس کے بعد پٹھانے خان گرد باد کی طرح زمینوں سے آسمانوں کی طرف لپکا۔ اسے کسی تقدس کی تلاش تھی۔ لفظ اس کے نہ تھے کسی عارف کے تھے۔ آواز اس کی تھی۔ وہ زمین سے آسمان کی طرف لپکا۔

"کن فیکون فرمایو جداں
اساں کول تساڈے ہاسے"

چاچے اور استاد کے درمیان خاموشی کا رابطہ تھا اور پٹھانے خان اپنے سفر میں۔ اس کی آواز

آسمانوں سے زمینوں پر رحمتوں کی طرح اُترتی تھی۔ دیر گئے چاچے نے اپنی زنبیل میں ہاتھ ڈالا اور پھر کڑک برآمد ہوئی۔ زمینوں اور آسمانوں کے درمیان خاموشی چھا گئی۔ ''قریب رہنا ضروری ہے۔ کوئی کسی سے دُور نہیں ہوتا۔ قریب رہنا ضروری ہے۔ ہم جب اپنے اصل کے قریب تھے تو کوئی کسی سے دُور نہ تھا۔'' چاچا چلتے چلتے جوتے پہنتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ وہ چلتے چلتے جوتے پہنتا اور جوتے پہنتے پہنتے چل دیتا تھا۔ یہ ضروری نہ تھا کہ جوتوں کی اُس کے پیروں سے کوئی مناسبت بھی ہو یا نہیں۔ کھڑپ کھڑپ تھوڑی دیر میں کہیں دُور جا نکلی۔

''کمالے! پُتر خیر خیریت ہے؟ جلدی سے ریڑھی نکال۔ جاموں بے ہوش ہو گیا ہے۔ اسے ڈاکٹر کے پاس پہنچا۔ ہمت کر۔ ریڑھی نکال اور گلی کی نکڑ پہ لا۔ جاموں بے ہوش ہو گیا ہے۔''

کمالے کے گھر کی دیوار پر لمبی گردن نمودار ہوئی اور آواز اس کے درودیوار میں سرایت کر گئی۔ چاچا زبان کے ساتھ ساتھ پورے جسم سے شور مچا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی کھڑپ کھڑپ بھی گلی میں گم ہو گئی۔

جاموں ریڑھی پر بے ہوش پڑا تھا۔ وہ سخت گرمی میں کھیتوں میں کام کرتے کرتے نڈھال ہو گیا تھا۔ ریڑھی کے اِردگرد بہت سے مرد، عورتیں، بچے بار بار اُسے دیکھتے تھے۔ آگے آگے چاچا کھڑپ کھڑپ کی آواز میں راستہ بناتا جاتا تھا۔

قصبے کی ڈسپنسری میں ڈاکٹر اُس کا معائنہ کرنے میں مصروف تھا۔ باہر برآمدے اور درختوں کی چھاؤں میں لوگ کھڑے تھے۔ ''کوئی وقت تھا حکیم صاحب ہوتے تھے۔ پورے گاؤں کا علاج کرتے تھے۔ گھر گھر جا کر۔ کسی سے کچھ معاوضہ نہ لیتے تھے۔ جس نے جو دیا وہ کسی اور کی دوائی بنانے پر خرچ کر دیتے تھے۔ گاؤں قصبے میں بدل گیا۔ ہر چیز بدلتی جا رہی ہے۔ حکیم کی جگہ ڈاکٹر، معجون کی بجائے دوائیاں وہ بھی پہلے پیسے ادا کریں اور پھر صحت مند ہوں یا نہ ہوں۔''

کسی نے ماضی کو پکارتے ہوئے کہا ''نہیں نہیں۔ ایسا نہیں۔ بات ایک ہی ہے۔ حکیم ہو یا ڈاکٹر، ایک نے دوسرے میں بدلنا تو ہوتا ہے۔ بات ایک ہے، اصل، اصل ہونا چاہیے۔ رشتے کی اصل دِل میں ہو تو پھر کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' چاچے نے اپنی نوکیلی لمبی ڈاڑھی کو سلجھاتے ہوئے کہا ''جاموں ہوش میں آ گیا ہے۔'' کمرے کے اندر سے زوردار آواز برآمد ہوئی۔

''کمالے اسے خیر خیریت سے گھر لے جانا۔'' چاچا اپنی کھڑپ کھڑپ کے ساتھ چل نکلا۔ بازار سے گزرتے ہوئے سونو مٹھائی والے نے چاچے کو روکا۔ ایک کاغذ پہ گلاب جامن رکھی اور چاچے کو پیش کر دی۔ اس کاغذ پہ دو انگریزوں کی تصویر تھی۔ ایک مرد اور ایک عورت۔ وہ دونوں بہت

خوبصورت تھے۔ گلاب جامن کے نیچے چکنے کاغذ پر ان انگریزوں کے نقوش بہت بھلے لگ رہے تھے۔

''تیری مٹھائی میں بہت خیر ہے سونو۔ چھوٹی اب خیر خیریت سے ہے۔ میں اسے صحت کی مبارک دوں گا۔ وہ تمہاری گلاب جامن کھائے گی۔'' چاچا یہ کہتے ہوئے کاغذ پر انگریزوں کو دیکھتے ہوئے کھڑپ کھڑپ کر گیا۔

چھوٹی اُٹھ بیٹھی تھی۔ حُسنِ فطرت نے معصومیت کی پوری آنکھیں وا کر دیں۔ پہاڑی اور سیانیاں بھی ان کے گرد آ کھڑی ہوئیں۔ چھوٹی نے گلاب جامن کھائی۔ چاچے نے کہا ''مبارک ہو۔ تم خیر خیریت سے ہو۔'' گلاب جامن چکنے کاغذ سے اُٹھنے کے بعد انگریز عورت اور مرد کے نقوش اور بھی واضح ہو گئے۔ گلاب جامن کی چکناہٹ نے کاغذ کو اور بھی چکنا اور چمکیلا کر دیا تھا۔ پہاڑی، سیانیوں اور چھوٹی نے بار بار خوبصورت انگریزوں کی تصویر دیکھی اس کے نیچے ''فیوچر شاک'' Future Shouk کے مصنّفین ایلون ٹافلر (Alvim Toffler) اور ہیڈی ٹافلر (Heddei Toffler) لکھا تھا۔ قریب کے گھر سے کسی ریڈیو پہ آواز بلند ہوئی۔ نور جہاں ترنم سرا تھی۔

''آندا تیرے لئی ریشمی رومال
تے اُتے تیرا ناں کڈھیا''

''اب تو ٹشو پیپر کا زمانہ ہے۔ یہ بے چاری ریشمی رومال کے جادو میں گرفتار ہے۔'' ایک سیانی بولی اور ایک مشترکہ قہقہہ پورے گھر پر بارش کی طرح اُترا۔ چاچے کے لمبے لمبے دانت مسکراہٹ سے نمایاں ہو گئے۔ ان پر پیلاہٹ نمایاں تھی۔ اس نے کاغذ اپنی زنبیل میں ٹیپ ریکارڈر کے ساتھ رکھ لیا اور کہا ''سب خیر خیریت ہے۔ رومال نہ سہی، ٹشو والا پیپر سہی۔ ایک ہی بات ہے۔ اصل میں بات ہونی اصل چاہیے۔ باقی سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' چاچا اپنے جملے صحن میں بکھراتا کھڑپ ہو گیا۔

اچانک گلی میں شور بلند ہوا۔ بہت سے لوگ گھروں سے باہر نکل آئے۔ استاد شکر دین، پہاڑی، سیانیاں اور چھوٹی کے علاوہ بہت سے لوگ۔ طاقت علی چاچے کے راستے میں کھڑا تھا۔ اس کے ماتھے پر لوہے کی ٹیڑھی میڑھی سلاخوں جیسی شکنیں نمودار ہوئیں۔ اس کے چوڑے جبڑے شکنجے کی طرح کَس گئے۔ ''خیر خیریت ہے۔ میاں طاقت علی، خیریت ہے۔'' چاچے کے لمبے پیلے دانتوں میں سے خیر خیریت پھسل پڑی۔

''خیر تو تم اپنی مناؤ۔ وقت بے وقت میرے گھر میں گھس آتے ہو۔ میری چار جوان بہنیں اور ماں ہیں۔ ان کو ریشمی رومالوں کے گانے سنواتے ہو۔''

''کیا کہہ رہے ہو طاقت علی۔'' استاد شکر دین نے اس کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھتے

ہوئے کہا۔

''تم یہ بات چاچے کو کہہ رہے ہو۔ یہ میرا شاگرد ہو کر بھی چاچا کہلاتا ہے۔تمہاری اماں سے بہت چھوٹا ہے وہ بھی اسے چاچا کہتی ہے۔سارے لوگ اسے اسی نام سے پکارتے ہیں۔ یہ اس کا نام نہیں کام ہے۔تم شاید اصل بات سمجھتے نہیں۔ یہ تو خیر خیریت ہے۔سراپا خیر خیریت۔ہم سب کی۔''

چاچے کے دانت ہونٹوں میں واپس چلے گئے۔ استاد اسے پکڑ کر اپنے گھر لے گیا۔ وہ دونوں درخت کے سائے میں بیٹھ رہے۔استاد گھبرایا ہوا تھا۔ بار بار چاچے کی طرف دیکھتا اور پھر اِدھر اُدھر۔ دیر تک کوئی حرف، کوئی لفظ، کوئی آواز ان کے درمیان نہ آئے۔ چاچے نے زنبیل میں ہاتھ ڈالا۔کڑک کی آواز کے ساتھ ہی پٹھانے خان فضاؤں پہ سوار ہو گیا۔اس کی آواز زمینوں سے آسمانوں کے سفر میں تھی۔الفاظ عارف کے تھے۔اس کے نہ تھے۔صرف آواز اس کی تھی۔

''نفس پلیت ، پلیت کیتا

اساں اصل پلیت ناں ہاسے''

پٹھانے خان کی آواز زمینوں سے آسمانوں اور آسمانوں سے زمینوں کے سفر میں تھی۔ زمینوں اور آسمانوں کے درمیان اس کا کہیں بھی ٹھہراؤ نہ تھا۔ چاچے کا ہاتھ زنبیل میں اُترا۔کڑک کی آواز آئی۔زمینوں اور آسمانوں کے درمیان بے چینیوں کا سفر کرتی پٹھانے خان کی آواز عدم ظہور میں چلی گئی اور چاچا کھڑپ کھڑپ کرتا گلی میں نکل گیا۔

چاچے کا نہ کوئی اپنا تھا نہ اپنا گھر ٹھکانہ۔قصبے کے سارے لوگ اس کے اپنے تھے۔مٹی کی دیواروں پہ تعمیر ایک مسجد میں فجر کی اذان دیتا تھا۔اسی کی دیواروں کی پناہ میں دِن یا رات کے کسی وقت ستا بھی لیتا تھا۔نہانا دھونا بھی مسجد کے کنوئیں میں کر لیتا۔اس کے لیے یہی سب کافی تھا۔وہ بے وطن نہ تھا۔ ہر گلی، دروازہ، دیوار، مرد،عورتیں، استاد،شاگرد، سیانیاں، نادان، چھوٹیاں، بڑیاں، طاقت ور، کمزور،سب اس کے اپنے تھے۔ جب سے قصبے میں چوری کی باتیں ہونے لگیں وہ رات رات بھر گلیوں میں ''خیر خیریت ہے۔سب خیریت ہے'' کی آوازیں لگاتا پھرتا رہتا۔ قصبے کے کچھ جوان اور بچے بھی اس کے ساتھ ہو لیتے۔اردگرد کی آبادیوں میں چوری، مار کٹائی اور اغواء کی وارداتوں کی خبریں افواہوں کی طرح پھیلتی رہتی تھیں۔مگر قصبے میں کوئی ایسا واقعہ پیش نہ آیا۔وہ ایسی ہی ایک رات کی خیر خیریت بتا کر اذانِ فجر کے لیے مسجد میں داخل ہوا۔صحن میں ایک نوجوان سر پہ عالمانہ دستار سجائے اُنگلیوں میں تسبیح گھمارہا تھا۔اس کا لباس براق سفید اور ڈاڑھی چمک دار، سیاہ تھی۔طاقت علی اس کے پاس وضو کر رہا تھا۔''مولانا! طاقت علی! سب خیر خیریت ہے؟''

''بڈھے شیطان! آئندہ اس پاکیزہ مسجد کو ناپاک کرنے کی جرأت نہ کرنا۔ بہت برا ہوگا۔''
طاقت علی وضو کرتے ہوئے دھاڑا۔ مولانا نے تسبیح کے دانے گرانے کی رفتار تیز کر دی۔ وہ بار بار اپنی چمک دار سیاہ ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔

طاقت علی نے اپنی چوڑی کلائیوں سے پانی پونچھتے ہوئے اپنی بات دُہرائی۔ چاچے کے ہونٹ پھیل گئے۔ اس کے لمبے لمبے دانت نمودار ہوئے۔ ان پر خاصی پیلاہٹ تھی۔ وہ خیر خیریت، سب خیریت کی آوازیں لگاتا کھڑپ کھڑپ کرتا کہیں چل دیا۔ اس کی زنبیل سے اذانِ فجر کی طرح پٹھانے خان کی صدا اُٹھی اور زمینوں سے آسمانوں کے سفر پر چل نکلی۔

''مار نہ مُلّاں موہلڑیاں
اسیں ازلوں ساہی ستھرے ہُو
مسجد ، مندر، وید ، کتاباں
اسیں اپنے آپ تے اُترے ہُو''

اس کی آواز کے ساتھ فضا میں ہر طرف مسجد، مندر، وید، کتاباں بادلوں کے ٹکڑوں کی طرح تیرنے لگے۔ نہ بادلوں میں بہشت کے پانی تھے اور نہ کسی آنکھ میں آنسو۔ مسجد، مندر، وید، کتاباں آپس میں ٹکرانے لگے۔ فضا میں بے پناہ گھن گرج تھی۔ وہ اس کی آواز میں زمینوں سے آسمانوں اور آسمانوں سے زمینوں کے سفر میں شامل ہوگئی۔ آسمانوں سے اُترے ہوئے امن نے قصبے کے ہر طرف نظریں دوڑائیں۔ پٹھانے خان خاموش ہوگیا اور فضا میں ٹھہراؤ کا تاثر پیدا ہوتا گیا۔ چاچا اس مسجد کی طرف پھر کبھی نہ گیا۔ قصبے کی دوسری مسجدیں پکی تھیں۔ ان میں سنگِ مرمر کی ٹائلیں نور بھر دیتی تھیں۔ ہر مسجد کا اپنا امام تھا۔

چاچا اپنے خیر خیریت کے معمول کی زندگی بسر کرتا رہا۔ اسے کسی بھی ہونے والے نئے واقعہ کی سمجھ نہ تھی۔ وہ گلی گلی میں دیوار، دیوار پر سے گھروں کے صحنوں میں خیر خیریت بکھراتا رہتا۔ استاد شکر دِین اسے پکڑ کر اپنے گھر لے گیا۔ چاچے نے روٹی کے چند نوالے کھائے اور درخت کے نیچے حُقّہ نوشی کرنے لگے ''چاچا! میں آج تک سمجھ نہیں پایا۔ تو کتنا نالایق شاگرد تھا۔ مگر تیری باتوں میں بڑے معنی ہوتے ہیں۔ تو بہت سمجھ داری کی باتیں کرتا ہے۔ تو نے یہ سب کچھ کہاں سے سیکھا پڑھا۔'' چاچے کے لمبے لمبے دانت نمودار ہوئے۔ ان پر پیلی پھپھوندی کی تہ موٹی ہوتی جا رہی تھی۔

''نہیں استاد۔ ایسا نہیں۔ میں کچھ نہ سمجھوں۔ کچھ نہ جانوں۔ بس ایک ہی بات سمجھ پایا ہوں کہ میں کچھ نہ سمجھوں کچھ نہ جانوں۔'' چاچے نے جوتوں میں سے پاؤں کھینچے اور چارپائی پر لمبا ہوگیا۔

''چاچا! تمہیں احتیاط کی ضرورت ہے۔ قصبے کا ماحول بدل رہا ہے۔ تمہیں نہ سمجھ سکے گا۔ کوئی تمہارے ساتھ اس عمر میں زیادتی نہ کرے۔'' استاد نے حقے کا دُھواں ہَوا میں پھینکتے ہوئے پریشانی کا اظہار کیا۔ چاچے کا ہاتھ پہلو میں لپٹی زنبیل کی طرف بڑھا۔ پٹھانے خان استاد سے مخاطب تھا۔

''بلھے شاہ اسیں مرنا ناہیں
بلھے شاہ اسیں مرنا ناہیں
بلھے شاہ اسیں مرنا ناہیں
گور پیا کوئی ہور''

الفاظ اس کے نہ تھے۔ آواز اس کی تھی۔ درخت کی چھاؤں میں ٹھنڈک میں اضافہ ہوگیا۔ دُھوپ درخت کے پتے چوم چوم کر آسمانوں کی طرف لوٹ جاتی تھی۔ چاچا سو گیا۔ اسے سوتے ہوئے کسی نے پہلے کبھی نے نہ دیکھا تھا۔ وہ دیر تک سوتا رہا۔

گوالا گلی میں ایک دروازے پہ بیٹھا دودھ ناپ تول کر دے رہا تھا۔ کاما مزدور دُودھ کا برتن اُٹھائے ہوئے تھا۔ چاچے کو دیکھتے ہی چہک اُٹھا۔

''میں نے آج بہت دِنوں کے بعد چھٹی کی ہے۔ مزدوری بہت مشکل کام ہے۔ جس دِن کام پہ نہ جاؤ گھر میں چولہا ٹھنڈا۔ چاچا خیر ہے نا سب۔''

''خیر خیریت بھائی کامیاں۔ مزدوری بڑی بات ہے۔ عزت ہے اس میں۔ پہلے ہم ایک دوسرے کے کاموں میں ہاتھ بٹاتے تھے۔ اب ایسا نہیں۔ لوگ کام کے بدلے کام کرانے کی بجائے مزدوری ادا کر دیتے ہیں۔ یہ دُودھ والے کو دیکھو۔ دُودھ بیچتا ہے۔ کبھی سُنا تھا کسی نے دُودھ بیچا؟ لوگ کہتے تھے، دودھ خدا کا نور ہے۔ کوئی نور بیچ سکتا تھا۔ مگر اب ایسا نہیں۔ پہلے ہم کسی سے دُودھ لے کر گُڑ شکر دے دیتے تھے۔ اب نہیں دیتے اور اس کی قیمت ادا کر دیتے ہیں۔'' چاچے نے گوالے کا حال احوال پوچھتے ہوئے کہا۔

''ہاں چاچا تم بات تو صحیح کرتے ہو لیکن پتہ نہیں کیوں پُرانی باتیں اور برتاؤ بہت یاد آتے ہیں تو ایسی بات منہ سے نکل جاتی ہے۔'' کاما مزدور دُودھ کا برتن اُٹھائے صحن کی طرف مڑ گیا۔ چھوٹی دُودھ لینے کے لیے باہر آئی اور چاچے سے لپٹ گئی۔

''چاچا! اماں اور سیانیوں سے نہ ملو گے؟''

''کیوں نہیں بیٹا۔ ان کی خیر خیریت تو معلوم کر کے جاؤں گا۔''

سیانیاں پہاڑی کے پیچھے کھڑی مسکرا رہی تھیں۔ پہاڑی کے چہرے پر سنجیدگی طاری تھی۔

عرصہ ہوا اس کے بیٹے کا خط نہ آیا تھا۔ وہ اس کے لیے اُداس تھی۔ وہ اپنے پوتے کو دیکھنے کے لیے حج کرنا چاہتی تھی۔ وہ پریشان اور سنجیدہ تھی۔ اپنے برسوں سے بچھڑے بیٹے کو دیکھنے، ملنے اور اس بات کرنے کی آرزومند تھی۔ وہ اپنی مرضی کے کسی رابطے کی خواہش کرتی تھی۔ یوں بھی بڑھاپا انسان کے چہرے پر سنجیدگی کا غازہ سجا دیتا ہے۔ چھوٹی چاچے سے لپٹی رہی۔ ساتھ کے گھر سے ریڈیو پہ ایک نغمے کی گونج سنائی دی۔

واسطہ ای رب دا توں!
جاویں وے کبوترا
چٹّھی میرے ڈھول نوں
پہنچائیں وے کبوترا''

''کبوتر کو کون پوچھتا ہے۔ اب تو جگہ جگہ ڈاک خانے کھل گئے ہیں۔'' ایک سیانی بولی۔

''ڈاک کی بات کرتی ہو۔ ٹیلی فون نے ڈاک کی ضرورت ہی نہیں رہنے دی اور پھر موبائل۔ ہائے اللہ ڈا کیا بے چارہ۔'' دوسری نے کہا اور ایک زوردار قہقہہ در و دیوار سے ٹکراتا فضا میں بکھر گیا۔

''ہونہہ! ٹیلی فون اور موبائل۔ کمپیوٹر نے دُنیا بھر کو ایک کر دیا ہے۔ ای میل، کبوتر صرف دانہ دُنکا چُگنے کے لیے رہ گیا ہے۔'' تیسری نے کہا اور سب نے مِل کر قہقہہ برسایا۔ فضا میں چاندی کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ پہاڑی چِٹھی اور کبوتر کے نغمے کے جادو میں سرشار تھی۔ اس میں اس کی مرضی کی بات تھی۔

''سیانیاں کتنی سیانی ہوگئی ہیں کیسی کیسی باتیں کرتی ہیں۔ خیر خیریت سے رہیں۔ سب بیٹیوں کے ڈولے اُٹھاؤں گا۔ بس خیر خیریت ہو۔'' چاچا بڑبُڑاتے ہوئے باہر گلی میں نکل آیا۔

''بڈھے شیطان۔ تو پھر میرے گھر کی دہلیز کو ناپاک کرنے آ پہنچا۔'' طاقت علی چلا رہا تھا۔ پہاڑی اور ہمسایہ استاد شکر دین بھاگ کر گلی میں پہنچے۔ ذرا سی دیر میں گلی لوگوں سے بھر گئی۔ طاقت علی اول فول کہے جا رہا تھا۔ چاچے کے ہونٹوں میں سے لمبے لمبے دانت نمودار ہوئے۔ ان پر پپلی تہہ موٹی ہوتی جا رہی تھی۔ طاقت علی لوہا کاٹتا کوٹتا تھا۔ اس کے ہاتھ ہتھوڑوں کی طرح ہو چکے تھے۔ اس نے چاچے کے سینے پہ دو ہتڑ ماری۔ لمبا سا لچک دار بوڑھا بدن چکرایا اور دیوار سے جا ٹکرایا۔ اس کے ہونٹ بڑبڑا رہے تھے ''خے خے۔۔۔ خیررر ریت، سب'' وہ دیوار سے ٹکرا کے اینٹوں سے بنائی گئی گلی میں گرا ''خے، اے، ریر۔ ر۔ ر'' چاچے کے ہونٹوں سے پھر کوئی آواز برآمد نہ ہوئی۔ سارا قصبہ اکٹھا ہو گیا۔ پولیس والوں کو دیکھ کر شور مچاتے لوگ خاموش ہو گئے۔ طاقت علی کو آہنی کلائیوں میں ہتھکڑی پہنا

کر وہ چلتے بنے۔انھوں نے کسی سے کوئی گواہی نہ مانگی، نہ کسی نے دی۔ وہ سب چاچے کی خیر خیریت کی باتیں کرر ہے تھے۔کسی نے چاچے کو بلانے کی کوشش کی تو اُس کی زنبیل سے ایلون ٹافلر اور ہیڈی ٹافلر کی تصویر ہوا کے جھونکوں پر سوار کہیں اُڑ گئی۔ وہ دونوں انگریز میاں بیوی نئی نئی تبدیلیوں کو قبول کرنے کے طریقے اپنی کتابوں میں لکھتے تھے۔اس لیے کہ لوگ پرانی چیزوں کو چھوڑ کر صرف افسردہ نہ ہوں بلکہ نئی باتوں کی خوشیوں میں جی سکیں۔استاد شکر دین نے اس کے دُور گرے پڑے ٹیپ ریکارڈر کو چھوا تو پٹھانے خان بول اُٹھا۔اس کی آواز زمینوں سے آسمانوں اور پھر زمینوں کے سفر میں تھی۔

''فرقت ، خیر خیراب کیتا
نہ تاں ذاتی ہاسے خاصے''
(خیر سے دُوری نے ہمیں خراب کیا ورنہ ہم اپنی ذات میں بہت ہی خالص تھے)

سیانیوں نے اپنے اپنے دوپٹے چاچے پر پھیلا دیئے۔ پہاڑی نے بھی ایسا ہی کیا۔ بہت سی دوسری عورتوں نے بھی یہی کیا۔ چاچا دوپٹوں کے مزار کی طرح لگ رہا تھا۔ چھوٹی دوپٹوں کے مزار پر گر گئی۔مزار کا آدھا حصہ اس کے گھنے بالوں سے حجاب میں تھا۔اس کا سفید صفا گلابی دھاریوں سے سجا موم کی گڑیا سا چہرہ چاچے کے سینے میں پناہ گزینوں کی طرح چھپ گیا۔انگریزوں کی تصویر اور پٹھانے خان کی آواز فضا میں آہستہ آہستہ تحلیل ہو کر لوگوں کی سسکیوں اور آنسوؤں میں شامل ہو گئیں۔

ooo

گھر کا راستہ

–سلطان جمیل نسیم–

بات عجیب سی ہے لیکن سچ ہے کہ میں اپنے گھر کا راستہ بھول گیا ہوں اور اب پریشانی کے عالم میں گلیوں گلیوں بھٹک رہا ہوں اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہر گھر کو دیکھ رہا ہوں۔۔۔سب گلیاں مجھے اپنے گھر تک جاتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں، ہر گھر پر اپنے گھر کا گمان گزرتا ہے مگر گلی ملتی ہے اور نہ گھر۔۔۔

مدتوں بے وطنی کی چادر اوڑھے رہا ہوں، ایک طویل عرصہ تک یہاں کی مٹی، پانی اور دھوپ کو ترستا رہا ہوں مگر میرے دِل میں اپنوں کی محبت، مٹی کی چاہت کا بیج گھر کے سائے دار تصور میں ایک ننھی سی کونپل سے چھتنار درخت کی صورت پھلتا پھولتا اور بڑھتا ہی رہا ہے۔

اور اب۔۔۔اب میں اسی گھنے درخت کا سایہ اپنے دِل و دماغ میں بسائے اپنے گھر کے راستے کے لیے بھٹک رہا ہوں۔۔۔

ایک گلی کے نکڑ پر رُکنے کے بعد میں نے سوچا کہ پہلے وہ تمام نشانیاں تلاش کرلوں جو گھر کے آس پاس ہونے کے علاوہ میرے ذہن میں بھی موجود ہیں لیکن میرے ذہن میں جوں کی توں برقرار رہنے والی نشانیوں کا عکس میرے اطراف میں کھڑی ہوئی عمارتوں کے در و دیوار پر نظر نہیں آ رہا ہے۔۔۔ شاید میں غلط جگہ آ گیا ہوں، شاید قدموں تلے بچھے ہوئے راستے میرے ماضی کی سمت سے نہیں آ رہے ہیں اور جو راستہ ماضی سے کٹ جائے وہ آنے والی دُھند میں اس طرح لپٹ جاتا ہے کہ آگے سوائے بے یقینی کی پرچھائیوں کے کچھ دِکھائی نہیں دیتا، ان سارے خیالوں کے ساتھ ساتھ گھر کی تلاش کا خیال بھی ڈھلتی دھوپ کے مانند میرے ذہن کے اُفق پر روشن تھا، رات ہونے سے پہلے پہلے اگر میں گھر

تلاش نہ کر سکا تو کیا ہوگا؟ اس سوال نے میری جستجو کے پیروں میں پڑی ہوئی تساہلی اور لاپرواہی کی رہی سہی بیڑیاں بھی اُتار پھینکیں اور میں دیوانوں کی طرح گلیوں کی بھول بھلیوں اور مکانوں کے جنگل میں اپنے ٹھکانے کے لیے دوڑ بھاگ کرنے لگا۔۔۔

جب تک سزا نہ ملے غلطیوں کا اعتراف کرنا تو دُور کی بات ہے ان کا احساس تک نہیں ہوتا، اب مجھے پچھتاوا ہونے لگا کہ میں نے گھر سے تنہا نکلنے کی غلطی کیوں کی۔۔۔آٹھ دس برس میں تو سارا شہر ہی نیا نیا سا لگ رہا ہے۔۔۔میں تو یہاں مانوس اجنبی بھی نہیں لگتا۔

جہاز سے اُترتے وقت مجھے اپنی بیوی کا چہرہ یاد تھا، سب بچوں کی صورتیں آنکھوں میں بسی ہوئی تھیں۔۔۔لیکن ایئر پورٹ کی روشنی میں سب کی شکلیں بدلی بدلی سی۔۔۔تصور اور تصویروں سے مختلف دِکھائی دیں۔۔۔ بیوی نے میرے بازو اِس طرح پکڑ رکھے تھے جیسے باز اپنے شکار کو پنجوں میں دبوچ لیتا ہے۔۔۔منجھلا اور چھوٹا بیٹا ڈھیلے ڈھیلے انداز میں گلے لگنے کے بعد سامان کی ٹرالی دھکیل کر لے جا رہے تھے اور بیوی کی عجلت ظاہر کر رہی تھی کہ وہ میرے اور بیٹوں کے درمیان فاصلہ برقرار رکھنا چاہتی ہے، میں نے چلتے چلتے بڑے بیٹے کے بارے میں پوچھا تو مجھے فخریہ لہجے میں بتایا کہ وہ اپنے کاروبار کو اور بڑھاوا دینے کے لیے شہر سے باہر گیا ہوا ہے۔۔۔کل شام تک آ جائے گا۔

کل رات اگر میں توجہ سے راستوں کو دیکھ لیتا اور گھر کی نشانیوں کو ذہن میں محفوظ کر لیتا تو آج یوں بے نشان نہ ہوتا۔۔۔مگر کل تو میں ہجر کے عذاب سے نجات پانے کی مسرت اور وصل کی لذتوں کے حصار میں یوں کھویا ہوا تھا کہ اپنے آپ کو بھول بیٹھا تھا۔۔۔ایک عشرے تک جو خواب دیکھتا رہا تھا، ان کی تعبیر دیکھنے کی خوشی میں نئے گھر کے راستے اور فاصلے کو نظرانداز کر گیا تھا۔

جب ایک مکان کے سامنے جا کر گاڑی ٹھہری تھی تو چھوٹے بیٹے نے پُھرتی کے ساتھ اُتر کر سعادت مندی کے انداز میں دروازہ کھولا۔۔۔اب میں نے دیکھا۔۔۔رواں سال کے ماڈل کی گاڑی تھی اور گھر بھی نیا تھا، میرے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی مجھے اندر لے جا کر ایک شاندار ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا گیا، ایئر پورٹ سے لے کر یہاں تک میں ایک معمول کی طرح اشاروں پر چل رہا تھا، اپنوں کی قربت نے مجھ پر جادو سا کر دیا تھا۔

میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سلب سی ہو کر رہ گئی تھی۔۔۔بس آنکھیں میری تھیں جلوہ ان

کا لیکن جب مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھایا گیا تو خواہ مخواہ مجھے ایک جھرجھری سی آئی۔۔۔ میں نے محسوس کیا کہ میں ایک طویل فاصلہ طے کر کے یہاں آیا ہوں لیکن شاید دُوری پھر بھی کم نہیں ہوئی ہے، اجنبیت کے احساس نے ایئرپورٹ پر ہی چٹکی سی لی تھی، آبادی بڑھ گئی ہے۔۔۔ ہر طرح کے مسائل بھی بڑھ گئے ہوں گے۔ پردیس میں تو سر کھجانے کی فرصت نہیں ملتی تھی اور یہاں، اس سجے سجائے ڈرائنگ روم میں اپنے قریب رکھی ہوئی سائیڈ ٹیبل پر کانچ کے ڈیکوریشن پیس دیکھ کر مجھے یہ احساس بھی ہوا کہ جیسے ہم سب کے درمیان شیشے کی دیواریں کھڑی ہیں، میں سب کی حرکات وسکنات دیکھ رہا ہوں، ہم سب کی نظریں ایک دوسرے پر ہیں، ہم ہنس رہے ہیں، بول رہے ہیں لیکن جیسے ہم ایک دوسرے کو چُھو نہیں سکتے، جیسے ایک دوسرے کی طرف محبت اور چاہت سے ہاتھ بڑھانے کی ہمت اس شیشے کی دیوار نے چوس لی ہے، باتیں ہو رہی ہیں مگر لفظ ان دیواروں سے ٹکرا کر ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر رہے ہیں اور اپنی ہی سماعتوں میں کرچیوں کی مانند چُبھ کر ایک بے کلی سی پیدا کر رہے ہیں، اور یہ بھی کہ جس طرح برسات کے موسم میں رات کے سیاہ ورق پر بجلی کی چمک ایک ٹیڑھی ترچھی لکیر کھینچ جاتی ہے، اسی طرح کبھی کبھی کوئی ایک آدھ لفظ، ادھورا سا جملہ خوفزدہ سا لمس، کھسیانی سی ہنسی، ان دیواروں سے چھن کر آ جاتی ہے ورنہ ایسا لگتا ہے سب اپنی ہی اپنی کہہ رہے ہیں، کوئی کسی کی بات سن نہیں رہا ہے، سب کے ہاتھوں میں اپنے ہی ہاتھ ہیں۔

میرے وجود میں حبس اور گھٹن کی کیفیت پیدا ہونے لگی، میں نے ٹائی کی گرہ ڈھیلی کی اور جوتے کے تسمے کھولنے کے لیے ذرا سا جھکا، اس وقت مجھے اپنی بیوی کی آواز سنائی دی، میں اس کے پرانے گرہستنوں والے لہجے کو پہچان گیا۔

''جب آپ نے دوسری مرتبہ پیسے بھیجے تو ہم نے یہ۔۔۔''

ابھی میں اس شناسائی کی گرفت میں پوری طرح آیا بھی نہیں تھا کہ میری نظر پہلو بدلتے ہوئے اپنے بیٹوں پر گئی، شاید یہ حبس ان کو بھی پریشان کر رہا تھا، شاید اس بولتی ہوئی خاموشی سے وہ بھی بیزار ہو رہے تھے۔ میں نے جب ان کے ہلتے ہوئے ہونٹ دیکھے تو ایسا لگا جیسے انھوں نے مجھ سے کچھ پوچھا۔۔۔ میرے بارے میں نہیں۔۔۔ اس اجنبی دیس کے بارے میں جہاں میں مشقتوں کی سیج پر آرام کے خواب دیکھا کرتا تھا اور جہاں وہ مجھے اپنے ہر خط میں لکھتے تھے کہ میں ان کو بھی وہاں بلا لوں اور اکثر ان کا خط ای میل کے ذریعے آتا جس کو میں Save کر لیتا اور فرصت کے وقت پڑھتا اور فرصت صرف رات میں ہی ملتی تھی۔

ظلمت و نور نے بتایا ہے

رات اپنی ہے دِن پرایا ہے

کبھی کبھی تو رات بھی اپنی نہیں رہتی تھی، نینداور تھکان مِل کر بستر پر دھکیل دیا کرتے تھے لیکن پھر بھی میں پہلی فرصت میں پڑھ لیا کرتا اور اگر وہ کبھی اپنی یہی خواہش پوسٹ کر دیتے تو کئی بار پڑھنے کے بعد اور اپنے کام میں مصروف رہتے ہوئے بھی اس جیب کو تھپتھپاتا رہتا جس میں ان کا خط رکھا ہوتا۔۔۔لیکن اب، جب میں ان کے سامنے بیٹھا ہوں تو ان کی گردنیں اس طرح جھکی ہوئی ہیں جیسے مجھ سے رشتے کا بوجھ ان کے سر پر رکھا ہو۔۔۔

جب میں اپنی جگہ سے اُٹھا تو لاشعوری طور سے یہ احتیاط برتنے لگا کہ میں کہیں اس غیر محسوس شیشے کی دیوار سے ٹکرا نہ جاؤں۔۔۔دیوار ٹوٹے یا نہ ٹوٹے میں ٹوٹ کر بکھر نہ جاؤں لیکن اس احتیاط کے باوجود مجھے گمان گزرا کہ کوئی شیشہ ٹوٹا ضرور ہے جس کی چبھن کا احساس میرے تمام وجود میں پھیل گیا ہے۔

یہ ہجر کی طویل راتوں کی تھکان تھی یا اپنوں میں آ ملنے کی خوشی یا پھر ان کرچیوں کی چبھن تھی، میں رات بھر اس طرح نہیں سویا جیسے بے غل وغش پردیس میں سویا کرتا تھا۔

سویرے اکیلا گھر سے نکل کھڑا ہوا، یہ دیکھنے کے لیے کہ اس شہر سے بندھی ہوئی نسبتوں کی ڈور کہاں سے ٹوٹی ہے، کہاں کہاں سے پہلے کی طرح مضبوط ہے اور کہاں کہاں گرہ دے کہ پرانے تعلقات کو بحال کیا جا سکتا ہے۔۔۔تنہا نکلنے کی بھی ایک وجہ تھی۔۔۔مجھے بدیس میں معاش کی پابندیوں نے سحر خیزی کا عادی بنا دیا تھا، پھر بھی بڑی دیر تک تنہائی لپیٹے بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔۔۔جب بیوی کو ٹہوکا دے کر اُٹھایا تو اس نے جمائی لے کر کروٹ بدلتے ہوئے کہا۔

''اُفوہ۔۔۔ابھی آپ کا جی بھرا نہیں۔۔۔''

''نہیں وہ بات نہیں۔۔۔''

''تو پھر سو جائیے، ہم لوگ دیر تک جاگتے اور دیر تک سوتے ہیں۔''

ہم لوگ۔۔۔کیا میری نفی کرنے کے بعد بھی یہ لفظ استعمال کیا جا سکتا ہے؟ اس سوال کے ساتھ ہی یہ خیال بھی آیا کہ یہاں آتے ہی شاید میرا رویہ الفاظ کے ساتھ بھی کچھ بدل سا گیا ہے، ہر لفظ کے پردے میں دوری اور اجنبیت کے سائے نظر آنے لگے ہیں اور ہر سنے ہوئے فقرے سے غیریت کی بوباس محسوس ہونے لگی ہے۔

اس خیال کے آتے ہی پہلے مجھے خود پر ترس آیا پھر ہنسی آئی، کیا ہو گیا ہے مجھے؟ میں انسانوں کا قصور بھی لفظوں کے سر منڈھنے لگا ہوں، ان بے چارے الفاظ کا کیا ہے، ایک کھیل ہے، ان سے گھروندہ بنا دو، بنا بنایا محل مسمار کر دو۔۔۔ ان سے اجنبیوں کو ملا دو یا اپنوں کو غیر بنا دو، ان کا تو کچھ نہیں بگڑتا۔۔۔ یہ تو سیپ کی طرح معنی کے موتی اپنے باطن میں چھپائے، بولنے اور لکھنے والے کی نیت کی ترجمانی کرتے رہتے ہیں۔

میں نے اپنی سوچ کے دھاگے کو زیادہ اُلجھنے سے پہلے لپیٹ دیا اور تیار ہو کر گھر سے نکل پڑا۔۔۔ کسی شہر کو دیکھنے کے لیے بھی آدمیوں کو سمجھنے کا سا انداز اختیار کرنا پڑتا ہے۔۔۔ یہ شہر تو میرا اپنا ہے لیکن اس شہر سے، یہاں کی آب و ہوا سے، شام و سحر سے، اپنے پرائے لوگوں سے مانوس ہونے کے لیے۔۔۔ عرصہ دراز کی غیر حاضری نے جو فاصلہ پیدا کیا ہے، اس فاصلے کو پاٹنے کے لیے مجھے تھوڑے سے وقت کی ضرورت تھی، اس لیے میں نے تھک جانے کی پروا کیے بغیر پیدل چلنے کو ہی ترجیح دی۔۔۔ پردیس میں بھی تو اکثر کرایہ بچانے کے لیے پیدل چلتا تھا۔ اس کا ایک فائدہ تو یہ ہوتا ہے کہ شہر سے اجنبیت کم ہوتی رہتی ہے اور دوسرا یہ کہ بہت سے چور راستوں کا پتا چل جاتا ہے۔

شہر میں گھومنے پھرنے سے معلوم ہوا کہ بعض علاقے میری طرح عمر رسیدہ ہو گئے ہیں بعض میرے خیالات کی طرح بالکل ایسے ہی ہیں جیسا میں ان کو چھوڑ کر گیا تھا اور بعض کی کایا ہی پلٹ گئی ہے، یہی حال پرانے واقف کاروں کا پایا، کچھ تو ایسے ملے جیسے کبھی بچھڑے ہی نہیں تھے اور کچھ ایسے جیسے مارے باندھے مل رہے ہوں، چند لوگ شہر چھوڑ گئے تھے اور کچھ دُنیا، جب سورج نے ڈوبنے کا اشارہ دیا تو میں نے واپسی کا ارادہ باندھا۔ بس یہیں سے گڑبڑ شروع ہو گئی، راستے آپس میں اُلجھ گئے اور میرے گھر کا راستہ گم ہو گیا، جب سوچنا شروع کیا تو یاد آیا میں تو گھر سے نکلتے ہی راستہ بھول گیا تھا، اب جس راستے پر قدم بڑھاتا وہ مجھے ڈرانے لگتا کہ دوسری سمت ہے، اب کیا کروں؟ جہاں راستہ لے جا رہا تھا، وہاں گھر نہیں تھا اور جہاں گھر تھا، وہاں کا راستہ بھول بیٹھا تھا۔

میں آتے جاتے لوگوں کو دیکھتا رہا اور اس خیال سے ہی خجالت سی محسوس ہونے لگتی کہ کسی راہ گیر کو روک کر اس سے پوچھوں کہ مجھے میرے گھر کا راستہ بتا دو۔۔۔ خاصی دیر تک شش و پنج میں مبتلا رہنے کے بعد اور مسلسل کسی بن جانے بوجھے راستے پر چلتے رہنے کی بجائے میں نے عافیت اسی میں جانی کہ اب شرمندگی تو ہو گی، مگر بھٹکنے سے بہتر ہے کہ کسی سے اپنے گھر کا راستہ پوچھ ہی لوں۔۔۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہو گا کہ میرا مذاق اُڑایا جائے گا یا مجھے نسیان کا مریض سمجھا جائے گا، کوئی پرواہ نہیں۔

ایسے ہی احساس وخیال کے ساتھ چلتے چلتے معلوم ہوا کہ سورج ڈوب گیا ہے اور میں جس راہ پر چلا جارہا ہوں، وہ بہت سے مکانوں کے درمیان گھوم رہی ہے اور بالکل سنسان ہے، صرف مکانوں کے روشندان اور کھڑکیوں سے ہلکی ہلکی روشنی پلکیں جھپک جھپک کر دیکھ رہی ہے۔۔۔ میں ایک انجان سی گلی کے نکڑ پر تنہا حیران سا کھڑا تھا کہ اچانک اس گلی میں قدموں کی چاپ اُبھری، میں چوکس ہو گیا، آنے والے سے اپنے گھر کا پتہ معلوم ہی کرلوں گا مگر وہ میری طرف آنے کے بجائے ایک مکان کے سامنے جا کر رُک گیا، میں لپک کر آگے بڑھا کہ اگر وہ اندر چلا گیا تو معلوم نہیں پھر مجھے کتنی دیر تک کسی دوسرے شخص کا انتظار کرنا پڑے گا، میں تیز قدموں سے اس کے قریب پہنچا، اپنی جھجک دور کر کے اور ہمت یکجا کر کے اپنے دِل ودماغ میں محفوظ گھر کا پتا بتا کر پوچھا تو وہ قہقہہ لگا کر بولا۔

''کمال کر دیا ڈیڈی آپ نے، گھر کے سامنے آ کر گھر کا پتا پوچھ رہے ہیں۔''

ooo

ہجر کی رات کا ستارہ!

-سمیرا نقوی-

شاخوں سے ٹکراتی دسمبر کی سرد ہوا، جوزف کی کھڑکی کے پٹ کھولتی چلی گئی۔ ہوا کمرے میں داخل ہوئی تو اُسے دوسراہٹ کا احساس ہوا۔ خاموش پڑی اشیاء کو ہوا دھیرے دھیرے ہلانے لگی۔ پیپر ویٹ کے نیچے دبے کاغذ گفتگو کرنے لگے۔ سٹیل کا خالی گلاس میز سے سرک کر زمین پہ جا گرا۔ گلاس گرنے کی آواز تا دیر کمرے کے سکوت میں بازگشت کرتی رہی۔

اُس کی کھڑکی پہ جھکی پُرانے برگد کی شاخیں بار، بار دستک دے رہی تھیں۔ ہوا آوازوں کے راستے کھولتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ قریبی گرجا گھر سے گھنٹیوں کی صدائیں اُس کو بستر سے ہلنے پر مجبور کر رہی تھیں۔ یادداشت کے پٹ کھل رہے تھے۔ وہ کان لگا کے سننے لگا۔ دُعا کے آخری کلمات، دھیرے دھیرے بجتی تالیوں کی صدا۔۔۔ شاخوں کی دستک۔۔۔ دسمبر کی ہوا میں کچھ شناسا لمحوں کی مہک۔

جوزف کی نظروں کے سامنے سوالیہ نشان بننے لگے۔ کیا آج 24 دسمبر ہے؟ وہ دیوار پر لٹکے ماہ و سال کا شمار ہندسوں میں کرتے کیلنڈر کو دیکھنے لگا۔ سوال کا جواب کیلنڈر پر لٹکا تھا۔

اس شب کے خاتمہ پر کرسمس کا سورج طلوع ہوگا۔۔۔!

اب ہوائیں ہی موسموں کی مخبر تھیں۔ وہ ہوا کے مزاج سے موسم کی پیشین گوئی کرنا سیکھ گیا تھا۔ یہ کھڑکی اُس کا بیرونی دُنیا سے رابطے کا واحد ذریعہ تھی۔

ہوا کے سنگ سفر کرتی آوازیں اُس کے کمرے میں لمحے بسر کرتیں تو اُسے اپنے ہونے کا یقین ہونے لگتا، دُعا آخری لمحات پہ تھی۔ دُکھ کا ایک بھاری پتھر اُس کے وجود پہ آ گرا۔ اب وہ اتنا ناکارہ ہو چکا ہے کہ کرسمس پر سال میں ایک بار بھی وہ گرجا جانے کے قابل نہیں رہا۔

دُکھ اور سردی باہم مِل کر اُسے نڈھال کر رہے تھے۔ وہ بستر سے اُٹھنا نہیں چاہ رہا تھا مگر اُسے اُٹھنا تھا۔ اُس نے ہاتھ مار کر سرہانے دھری گرم چادر کو ٹٹولا۔ اُس کے لرزیدہ ہاتھوں نے گرم اُونی شال کی نرماہٹ محسوس کی۔ گرم بستر کو دھیرے دھیرے اپنے وجود سے پرے ہٹایا۔ بیٹھے بیٹھے گرم شال لپیٹی اور پاؤں پلنگ سے لٹکا کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ اُس نے آخری بار ماچس کہاں رکھی تھی؟

سوچ کے زاویے ٹوٹنے لگے، تو وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ سرد، تاریک کمرے میں وہ روشنی کے اسباب پیدا کرنے لگا۔

دھیرے دھیرے چیزوں کو ہاتھ سے ٹٹول رہا تھا۔ میز، دراز، کرسی، سب جگہیں ہاتھوں سے کھوج لیں۔ مگر ماچس کا نام و نشان نہ تھا۔ سرد ہوا اُس کے سینے کو جکڑ رہی تھی۔ سانس اُس کے پھیپھڑوں میں اُلجھ کر دھیرے دھیرے رُک رہی تھی۔ وہ کھڑکی سے آتی ہوا کو اندر آنے سے روکنے کے لیے کھڑکی بند کرنے لگا۔ سرد ہوا اور اُس کے وجود کے درمیان گرم اُونی شال تھی۔ کھڑکی بند کرنے کو جو ہاتھ اُٹھے تو وہ چادر بھی اُوپر اُٹھی، سرد ہوا نے اُسے بے ساختہ کھڑکی سے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔

کھڑکی کے پٹ اُسی طرح کھلے رہے وہ ہاتھوں سے سینے کو دباتا ہوا کرسی پر بیٹھ گیا۔ بڑی مشکل سے وہ کرسی گھسیٹ کر کھڑکی کے مخالف سمت میں لے گیا۔ جہاں ہوا براہِ راست اثر انداز نہیں ہو رہی تھی۔

ہوا آتی رہی، کمرہ سرد رہا۔ دھیرے دھیرے اُس کی رُکی ہوئی سانس بحال ہونے لگی۔ آوازوں کے سفر کو بند کرنے کا ارادہ ترک کر کے وہ دوبارہ ماچس تلاش کرنے لگا۔

کمرے میں پڑی اشیاء کی سطح وہ ٹٹول چکا تھا یونہی بستر پر ہاتھ مارا تو سرہانے کے نیچے کھڑکھڑاہٹ محسوس کی۔ ماچس سرہانے کے نیچے دھری تھی۔ ماچس اُٹھا کر وہ کمرے میں رکھے اکلوتے میز کے اکلوتے دراز کو کھولنے لگا۔

گرجا سے آتی تالیوں کی آواز میں اب شدت آتی جا رہی تھی۔ دراز کھول کے اُس میں سے ایک چھوٹا سا پیکٹ نکالا جسے سرخ فیتے سے باندھا گیا تھا۔ اُس نے کانپتے ہاتھوں سے اُسے کھولا۔ چھوٹے چھوٹے چار جار، جن میں سرخ موم بھری تھی۔ اُس نے ایک ایک کر کے اُنہیں میز پر رکھا۔

اب وہ اُنگلیوں سے موم بتی کا دھاگہ ٹٹول رہا تھا۔ تین میں صرف پگھلی ہوئی موم تھی البتہ چوتھی موم بتی کا دھاگہ ابھی باقی تھا۔ سرد کمرے میں تیلی جلنے سے مدہم سی حرارت کا احساس جاگا۔ ایک، دو، تین ۔۔۔ ایک، ایک کر کے کئی تیلیاں جلتی بجھتی رہیں۔ مگر سردی سے اکڑے جار کے پیندے سے چپکا دھاگہ نہ جلا۔

مایوسی اور تھکاوٹ یکجا ہو کے اُس پہ غلبہ پا رہی تھیں۔ مگر گرجا سے آتی تالیوں کی صدا اُسے دِیا سلائی رگڑنے پر مجبور کر رہی تھی۔ ماہ و سال کی گرد سے اٹے شیشے کے چھوٹے سے گلاس میں سجا دھاگہ بالآخر جل اُٹھا۔

اُس کے ہاتھ دھیرے دھیرے تالیوں کی تال سے تال ملانے لگے۔ لب پہ کوئی دُعائیہ کلمات تھے اور ذہن کمرے کی فضا سے ہجرت کر گیا۔

ooo

وہ وصل کی چاہ میں سب گنوا کے ریلوے سٹیشن کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی پر ہجر اُس کے ماتھے پر لکھا تھا۔ گلے میں بندھا سرخ سکارف ہوا میں اُڑ رہا تھا۔ سرد ہوا گرم کوٹ سے جیسے جنگ کر رہی تھی۔ وہ سیڑھیاں چڑھ کر سٹیشن کی عمارت میں داخل ہو گئی۔ اِکا دُکا مسافر، کھڑکی میں اُونگھتا سٹیشن ماسٹر۔۔۔ ایک ہاتھ سے بیگ کو گھسیٹتی، دوسرے سے سکارف سنبھالتی کھڑکی کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اُنگلی سے کھڑکی کو بجایا، سویا ہوا ٹکٹ بابو ہڑ بڑا کے اُٹھا اور اپنے سامنے اِتنا روشن رُوپ دیکھ کر گھبرا گیا۔ ایسے لگ رہا تھا اُس کی کھڑکی کے سامنے کھڑی لڑکی کے آس پاس ڈھیروں چراغ جل رہے ہیں۔ روشنی ہی روشنی۔۔۔ وہ آنکھیں بند کرنا بھول گیا۔ لفظوں کے سِکّے سوچ کے تھال میں خاموشی سے گرنے لگے۔

''کراچی کے دو ٹکٹ چاہئیں۔'' وہ دھیرے سے بولی۔ کوٹ کی جیب سے پیسے نکال کر کھڑکی کے اندر رکھ کے، اُس نے حیران ہاتھوں سے ٹکٹ اور بقیہ ریز گاری جیب میں رکھی اور مڑ کے سیڑھیوں کی طرف دیکھا۔ کوئی مانوس چاپ نہیں تھی۔

وہ ٹکٹ لے کر پلیٹ فارم پہ بنے پتھر کے بنچ پہ بیٹھ گئی۔ درختوں پر سفید کُہر سی جمی تھی۔ ہر چیز دُھند میں لپٹی ہوئی تھی۔ اندھیرا دھیرے دھیرے پلیٹ فارم کے آس پاس قافلہ در قافلہ اُترنے لگا۔

ایسی ہی ایک شام تھی جب میں نے جوزف کو گرجا میں موم بتیاں جلاتے دیکھا تھا۔ موم کی لو مدہم تھی پر اُس کی آنکھوں کی لو تو کسی الاؤ سے بھی زیادہ روشن تھی۔ آنکھوں کے اِس الاؤ میں مجھے اپنا وجود خشک لکڑیوں کی طرح جلتا محسوس ہوا۔

میری ماں کو ہمیشہ گِلہ رہا کہ میں گرجا نہیں جاتی۔ اُس کے ساتھ اتوار کی دُعا میں شامل نہیں ہوتی۔ پہلے میں نہ جانے کے بہانے تراشتی۔ جوزف کو دیکھنے کے بعد میں جانے کے بہانے تلاش کرنے لگی۔ سب دُعا مانگتے، میں جوزف کو دیکھتی۔

وہ کبھی فادر کے سامنے دُعا کے صفحات ترتیب دیتا، کبھی گھڑیال کی سوئیاں درست کرتا، گرجا کی چار دیواری میں چکراتا رہتا اور میں اُس کے وجود کی چار دیواری سے ٹکراتی رہتی۔۔۔

کچھ تو ہو وہ اُس کے قدموں کو روک لے۔ آنکھوں کی چھلکتی روشنی کو ایک پل کے لیے مٹھی میں بھر لے۔

اُس سال کرسمس کی خریداری کرتے ہوئے میں نے جوزف کے لیے سرخ موم بتیوں کا پیکٹ اور چاکلیٹ خریدے۔ وہ ایک پل کے لیے تو اُس کے چکراتے قدموں کو روک لے گی۔

اتوار کی دُعا میں جب سب مگن تھے۔ آخری لمحات پہ چپکے سے باہر نکلی۔ وہ سب سے آخر میں دروازے کے پاس آنکھیں بند کیے، خدا جانے کیا مانگ رہا تھا؟

میں نے موم بتی کا پیکٹ جوزف کے ہاتھوں پہ رکھا۔ اُس کی آنکھوں میں جلتی بجھتی روشنیوں کی سی کیفیت تھی۔

اور آج وہ پلیٹ فارم کی دُھند اور تاریکی میں ایسی ہی روشنیاں ڈھونڈ رہی تھیں۔ اُس نے ٹکٹ نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیے اور ٹکٹ پر چھپے حروف پہ اُنگلی پھیرنے لگی۔ اُس کی نظریں ریل کی پٹڑی پر اور کان کسی آہٹ کے منتظر تھے۔ خالی پلیٹ فارم پر مسافر اندھیرے کا سکوت توڑنے لگے۔

''کراچی کی ٹرین کب تک آئے گی؟'' اُس نے پاس سے گزرتے ایک قلی سے پوچھا۔

''سات بجے تک آجاتی ہے۔'' وہ جواب دے کر آگے بڑھ گیا۔

''ابھی آنے میں چالیس منٹ ہیں۔'' اُس نے خود کو تسلی دی۔

''وہ گرجا سے نکلنے والا ہوگا۔'' اندھیرے میں اُمید کے جگنو پکڑے۔

پر وعدے کے مطابق تو اُسے پہلے آنا تھا۔ گرجا سے سٹیشن کا فاصلہ تو بہت تھوڑا تھا۔۔۔ بدگمانی سر اُٹھانے لگی۔

آج کرسمس کی تیاریوں میں مصروف ہوگا، تب ہی نہیں پہنچا۔ وہ کرسمس ٹری کے قریب موم بتیاں جلا رہا ہوگا۔ تصور میں وہی جلتا الاؤ۔۔۔

جوزف کہہ رہا تھا ''سب کام مکمل کر کے سیدھا اسٹیشن آؤں گا۔'' وہ اُس کی آخری گفتگو سے حرفِ یقین تلاش کرتے ہوئے بھروسے کا سائبان تعمیر کرنے لگی۔

دھیان ہٹانے کے لیے وہ خود کو گھر کے چھوٹے سے آنگن میں لے گئی۔ جہاں سب کرسمس ٹری سجا رہے ہوں گے۔ چاکلیٹ کے پیکٹس بن رہے ہوں گے۔ اُس کے نہ ہونے کا احساس تو بہت دیر میں ہوگا اور تب تک وہ شاید شہرِ وصال میں پہنچ چکی ہوگی۔ ستارے اُس کی آنکھوں میں اُترنے لگے۔ بےخودی نے بہت دیر تک اُسے اپنے حصار میں رکھا۔

پلیٹ فارم پر ہلچل بڑھنے لگی تو اُس کے وجود پہ چھایا طلسم ٹوٹنے لگا۔ ٹرین کے آنے میں

صرف پندرہ منٹ رہ گئے تھے۔ وہ مڑ مڑ کے دیکھ رہی تھی۔

اور وہ۔۔۔

وہ کرسمس کی تیاریاں کرتا خود کو سنبھالتا اندر باہر آجا رہا تھا۔ گھڑیال کی سوئیاں اُسے بے جان کر رہی تھیں۔

''وہ جائے یا نہ جائے۔۔۔؟''

یہ سوال اس کے لیے دلدل بن گیا تھا جہاں سے نکلنا مشکل ہو رہا تھا۔

وہ انتظار کر رہی ہوگی۔ ٹکٹ لے چکی ہوگی۔ سرخ سکارف اُس کی گردن سے لپٹا ہوگا۔ ہاتھ کوٹ کی جیب میں اور ناک سردی سے سرخ ہو چکی ہوگی۔ پھیلتے اندھیرے میں اُسے کھوج رہی ہوگی۔

قدم بڑھنے لگتے، وہ جونہی گرجا کی سیڑھیوں پہ قدم رکھتا، ذات کی گرہیں کھل جاتیں۔ اُس کا ماضی یہی سیڑھیاں تھیں۔ وہ انہی سیڑھیوں سے جڑا تھا۔ اُس کے ماضی کا سفر بس یہیں تک تھا۔

نہیں، وہ اُسے بے نشان نہیں کرے گا۔

وہ اُسے سوالوں کے جنگل میں نہیں پھینکے گا۔

قدم پھر اندر کی طرف مڑ جاتے۔۔۔

وہ نہ جا سکا نہ اُسے روک سکا۔

ہجر ریل کی پٹڑیوں کی طرح اُن کے درمیان پھیل گیا۔

گاڑی پلیٹ فارم پر رُکی۔ ٹکٹیں برف موسم میں اُس کی ہتھیلی میں بھیگنے لگیں۔ غصہ، بے بسی۔۔۔ بے اعتباری اور وہ تنہا۔۔۔ وہ کس کس کا مقابلہ کرتی۔۔۔ آنسو ٹوٹنے لگے۔

لوگ بھاگم بھاگ ٹرین پہ سوار ہو رہے تھے۔ وہ پلیٹ فارم پہ بیٹھی ٹرین کے ڈبے گن رہی تھی۔ اُس کے نام کا کوئی ڈبہ نہیں تھا۔

ٹرین سرکنے لگی۔ دُھواں اُٹھا، وِسل بجی۔ بند مٹھی کھلی، ٹکٹ کسی کے بھاری قدموں تلے آ کے نجانے کہاں گئے۔۔۔

گاڑی پلیٹ فارم کی حدود سے نکل گئی۔ اُسے لگا جیسے اُس کی سانس رُکنے لگی ہو۔ ہاتھ بے اختیار سرخ سکارف پہ پڑا، وہ اُڑا اور ایک خشک، جھاڑ دار کیکر کی شاخ سے جا اٹکا۔

جوزف نے سرخ فیتے سے بندھے اُس پیکٹ کو کھولا، اُس کے نام کی موم بتی جلائی اور اُس کی مدہم لو میں وہ خود بھی جلنے لگا۔

ooo

روشن دائرہ

— عظمیٰ عزیز خان —

ایک آدمی تھا، سیدھا سادہ اور بالکل سچا سا۔ سادہ سادہ سی صبحوں اور سادہ سادہ سی شاموں والا۔ جس کے نہ کوئی بھید تھے نہ راز۔ وہ اِتنا سیدھا سا تھا کہ اگر کبھی چالاک بننے کی کوشش کرتا تو پکڑا جاتا اور جب وہ پکڑا جاتا تو ہنس دیتا اور پھر سے سیدھا سادہ آدمی بن جاتا۔ اس کے خون میں اس کے باپ کی محبت شامل نہیں تھی کیوں کہ اس کا باپ ایک مست ملنگ آدمی تھا۔ ایسا مست ملنگ جس کی زندگی کے بہت بڑے دائرے میں بیوی اور بچے صرف چھوٹے چھوٹے نقطوں کی مانند رہ جاتے ہیں۔ چنانچہ وہ محبت کے لین دین کے معاملے میں اپنے باپ کے باپ کی ذمہ داری بن گیا اور اُس ذمہ دار آدمی ء نے اس سیدھے سادے آدمی کو محبت سے بھر دیا۔ اندر سے، باہر سے، پورے کا پورا۔ سارے کا سارا، اس کی زندگی کا ہر لمحہ، ہر پل!

پھر ایک دِن وہ ذمہ دار آدمی ایک لمبے سفر پر روانہ ہو گیا لیکن جانے سے پہلے اس نے محبت کی مشک کا کچھ حصہ اپنی ناف سے نکال کر اس کی ناف میں رکھ کر اس عام سے آدمی کو بہت خاص بنا دیا۔ محبت کی مشک ہوا کے پروں پر بیٹھ کر جہاں جہاں جانے لگی، آدمی کی محبت کا دائرہ وہاں وہاں پھیلنے لگا۔ وہ آگے آگے چلنے لگا، لوگ اس کے پیچھے پیچھے آنے لگے۔ محبت کے دائرے بننے لگے۔ ماں، باپ اور بھائی کا دائرہ، رشتہ داروں کا دائرہ، دوستوں یاروں کا دائرہ، وہ لوگوں کو محبت سے راضی رکھنے لگا۔ لمبے سفر پر جانے والا آدمی اُسے کون سا ہنر سکھا گیا تھا، اس کا بھید اس نے کبھی نہیں کھولا۔

دائروں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ انھی بنتے ہوئے دائروں میں ایک اور دائرہ بنتا ہے۔ چھوٹا سا، ایک نقطے کی مانند اور اس دائرے میں ایک لڑکی آ کر رُک جاتی ہے۔ یہ لڑکی اُس کی اپنی بیٹی ہے جسے اپنے شعوری سفر کے اِبتدائی مرحلے ہی میں اپنی ماں کی گود کی گرمی کے مقابلے میں اس آدمی کے

سینے کی ٹھنڈک زیادہ اچھی لگتی ہے۔ چنانچہ اس کی ماں دُور کہیں اس کے پس منظر میں چلی جاتی ہے اور اس کا باپ اُس کے پیش منظر میں آجاتا ہے۔لڑکی زندگی چلنا شروع کرتی ہے۔اس کا بچپن اپنے باپ کی جوانی میں جھانکتا ہے اور اُسے جائے نماز پر کھڑا کر دیتا ہے۔کبھی قیام،کبھی رکوع اور کبھی سجدے کی حالت میں، وہ اپنا سکول کا کام ہاتھ میں پکڑے، انتظار کرتے کرتے سو جاتی ہے اور جب اگلے دِن اُٹھتی ہے تو اُس کو وہیں کھڑا پاتی ہے۔

وہ اپنے باپ کی جوانی سے کان لگا کر کچھ سننے کی کوشش کرتی ہے تو درود پاک کے مقدس الفاظ اس کی سماعتوں میں جڑ جاتے ہیں۔صبح اُٹھتے ہوئے،سکول کے لیے تیار ہوتے ہوئے، ناشتہ کرتے ہوئے کتابیں بستے میں رکھتے ہوئے اُس کے کان درود پاک کے لمس کو محسوس کرتے رہتے ہیں۔ پھر ایک دِن وہ زیرِلب اس آدمی کے ساتھ ساتھ پڑھتے ہوئے اس درود کو یاد کر لیتی ہے۔سنی سنائی کسی چیز کو یاد کرنے کا یہ اُس کا پہلا تجربہ ہے۔ وہ دیکھتی ہے کہ اِتنا کم بولنے والے کے چاہنے والے اس کی باتوں سے زیادہ ہیں۔ وہ حیران ہو کر اس کی طرف دیکھتی ہے تو وہ ہنس دیتا ہے اور اس کی توجہ ہٹانے کے لیے اُس کی اور اُس کے بھائیوں کی اُنگلی تھامے باہر نکل جاتا ہے۔کبھی چڑیا گھر،کبھی کسی ہوٹل میں، کبھی کسی پارک میں،کبھی ایک شہر اور کبھی اُس سے اگلے شہر۔

دائروں پر دائرے بن رہے ہیں۔ وہ انھیں ساتھ ساتھ لیے چل رہا ہے کہ اچانک منظر بدلتا ہے اور زندگی میں اُونچ نیچ آجاتی ہے۔ آدمی بیمار ہو جاتا ہے اور کچھ دائرے نامکمل رہ جاتے ہیں۔انھی نامکمل دائروں میں لڑکی کا اپنا دائرہ بھی ہے جو آہستہ آہستہ بڑھتا جاتا ہے، پھیلتا جاتا ہے اور بڑھتا ہوا، پھیلتا ہوا نامکمل دائرہ اس آدمی کے گرد زیادہ تیزی سے گھومنے لگتا ہے۔تیز،تیز اور تیز۔منظر میں کچھ اور چیزوں کا اضافہ ہو جاتا ہے۔لڑکی وقت کی رَو میں بہہ کر سکول سے کالج اور کالج سے یونیورسٹی آجاتی ہے۔ ڈاکٹر ہیں، دوائیں ہیں، احتیاطی تدابیر ہیں اور لڑکی کے نامکمل دائرے میں گرتے اضطراب اور بےچینی کے رنگ ہیں۔اس آدمی کی زندگی مسجد سے گھر اور گھر سے مسجد تک محدود ہے لیکن اس محدود منظر کے تمام رنگ مکمل ہیں۔

لڑکی گھر سے پیپر دینے نکلتی ہے تو وہ اس کے ہاتھ میں تعویذ تھما دیتا ہے،اس کی کامیابی کے لیے۔بس پکڑنے کی جلدی میں وہ لڑکی کو صبح صبح ناشتہ کیے بغیر یونیورسٹی جاتا دیکھتا ہے تو اگلے دِن سے اپنے معمول کے وظائف مختصر کر کے اُسے ناشتہ بنا کر دینا شروع کر دیتا ہے۔ وہ اَز خود اس کی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کا خیال رکھتا ہے۔اُسے بتائے بغیر،اُس کے کہے بغیر۔وہ اپنے کام اُس کے حوالے کر کے مطمئن ہو جاتی ہے۔وہ جانتی ہے جہاں سے بھی، جیسے بھی ہو، کام ہو جائے گا۔وہ اس کی پریشانی پر

پریشان ہو جاتا ہے اور اس کی خوشی پر آسودہ۔ لڑکی اس سے تاش کھیلنا سیکھتی ہے۔ اپنے خواب اُسے سناتی ہے۔ اُس کے خواب سنتی ہے۔ کبھی کبھی شرارتاً اُس کا سگریٹ اُس کے سامنے بیٹھ کر سلگا کر اُسے دیتی ہے تو وہ ناراض نہیں ہوتا، ہنس دیتا ہے۔ وہ اُسے سنبھال سنبھال کر رکھتی ہے۔ اپنے دِل میں، اپنی سوچوں میں، کرسٹل کے کسی نازک اور خوبصورت گلدان کی طرح۔

زندگی کچھ قدم اور آگے کی طرف چلتی ہے۔ بیماری کا آسیب آدمی کا پیچھا نہیں چھوڑتا اور خوفزدہ راتیں لڑکی کے وجود سے لپٹنے لگتی ہیں۔ لڑکی کے اضطراب کے رنگ دِن بدن گہرے ہوتے جاتے ہیں۔ دُعاؤں میں تیزی آتی جاتی ہے۔ کام کرتے ہوئے، لوگوں سے ملتے ہوئے، باتیں کرتے ہوئے، ہنستے ہوئے وہ نامکمل دائرہ اس کے گرد کھنچا رہتا ہے۔ وہ بے چینی اور اضطراب کے رنگ جھاڑتی، جلدی جلدی گھر پہنچتی ہے تو اس آدمی کے وجود سے مہکتے برآمدے میں ایک خوشبو سے بھرا جملہ اس کا استقبال کرتا ہے ''تم اتنی دیر سے نہ آیا کرو۔ میں تمھارے بغیر اُداس ہو جاتا ہوں۔'' اور لڑکی کی ساری تھکن اس کے اعصاب سے نکل بھاگتی ہے۔ وہ نیچے جھکتی ہے اور اس کے ہاتھ کرسی پر بیٹھے آدمی کی ملگجی داڑھی کو چوم لیتے ہیں اور وہ آدمی اس کی پیشانی پر اپنے ہونٹوں سے ایک روشن دائرہ بنا دیتا ہے۔ وہ روشن دائرہ جس کی روشنی میں اُسے اِردگرد کے اندھیرے نظر ہی نہیں آتے وہ اس کا پہلا رہنما ہے، پہلا ہمدرد اور پہلا غمگسار ہے۔

منظر ایک بار پھر بدلتا ہے اور یہ بدلا ہوا منظر لڑکی کی زندگی کے کینوس پر ہمیشہ کے لیے جم جاتا ہے۔ اس منظر کے سارے رنگ سفید ہیں۔ پتھرائے ہوئے سفید رنگ، جذبوں سے خالی سفید رنگ، رنگوں سے خالی سفید رنگ۔ لڑکی کا بیمار باپ ہسپتال میں ہے۔ اس کی بگڑتی ہوئی طبیعت لڑکی کو پریشان کر رہی ہے اور ایک اور بے چین رات اس کی زندگی کی حصہ دار بن رہی ہے۔ کروٹ پر کروٹ بدلتی، قطرہ قطرہ چبھتی ہوئی رات۔ صبح کے انتظار میں کتنی بار لڑکی آنکھیں کھول کر اس رات کو دیکھتی ہے اور بند آنکھوں سے کتنی بار وہ سوچتی ہے کہ کاش رات اپنا چکر پورا کیے بغیر درمیان ہی سے لوٹ جائے۔ پھر کہیں دُور ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد کوئی اُس کے پاس آ کر اُس سے کچھ کہتا ہے جسے سن کر اُس کے پاؤں کے نیچے کی ساری زمین ڈول جاتی ہے۔

اُمید کا آخری سرا تھامے وہ ہسپتال چلی آتی ہے اور ہسپتال کی ایک چھوٹی سی راہداری کا موڑ مڑتے ہی اس کی ماں کے آنسو، یتیمی کے پہلے کڑوے احساس کے ساتھ اس کی رُوح میں گھل جاتے ہیں۔ زمین و آسمان دھلے ہوئے لٹھے کی مانند یک لخت سفید ہو جاتے ہیں۔ ہسپتال کی چھت بے سائباں ہو جاتی ہے۔ پھر کچھ سسکیاں ہیں، کچھ آنسو ہیں، کچھ دلاسے ہیں، اور اِدھر اُدھر تیزی سے آتے جاتے

کچھ لوگ ہیں اور تھوری دیر کے بعد سڑکوں پر دوڑتی بین کرتی اِک ایمبولینس ہے جس کی پیشانی پر ایک روشن دائرہ اس کی رہنمائی کر رہا ہے، لیکن لڑکی وہیں رُک گئی ہے، اس منظر سے پچھلے والے منظر میں، اُس آدمی کے ساتھ! وہ جانتی ہے اِس منظر سے باہر کچھ بھی نہیں ہے۔ نہ سیدھا سادہ آدمی، نہ روشنی کا دائرہ، نہ خوشبو سے بھرا جملہ۔ بس ایک خالی برآمدہ ہے، سڑکوں پر دوڑتی ایک ایمبولینس ہے، ساری زمین ڈولتی ہے اور ساری چھتیں بے سائباں ہیں۔ وہاں اندھیرے بہت صاف دِکھائی دیتے ہیں اور سارے راستے گم ہیں۔

OOO

کرچیاں

-فریال اِرم-

سکول ٹائم کے بعد وہ تین گھروں میں ٹیویشن پڑھاتی تھی۔اس طرح وہ ایک طرف تو اپنے بعض اخراجات پورے کرلیتی تو دوسری طرف اپنے وقت کو بہترین انداز میں صرف کرتی۔

جن لوگوں کے ہاں وہ ٹیویشن پڑھاتی تھی۔ایک گھنٹہ سے زیادہ وقت نہ دیتی۔لیکن سیّد مظاہر حسین کے گھر زیادہ وقت دینا پڑتا تھا۔کیونکہ ان کی بیٹی ماریہ سکول نہیں جاتی تھی۔وجہ یہ تھی کہ سیّد صاحب سکول بھیجنے کو معیوب سمجھتے تھے اور اسی وجہ سے اسے پرائیوٹ میٹرک کا امتحان دینا تھا۔

عطیہ غیر مسلم تھی۔لیکن اپنی لیاقت اور خوش اخلاقی کے باعث شاہ صاحب کو اس کے پڑھانے پر کوئی اعتراض نہ تھا۔شاہ صاحب کا گھر مختصر افراد پر مشتمل تھا۔ان کی اہلیہ دو سال قبل انتقال کرگئی تھیں اور بیٹا خالد پولیس انسپکٹر تھا۔لیکن اس کی پوسٹنگ دوسرے شہر میں تھی۔گویا شاہ صاحب کے گھر میں صرف دو افراد رہائش پذیر تھے۔ایک شاہ صاحب اور دوسری ان کی بیٹی۔خالد البتہ ویک اینڈ پر گھر آتا تھا اور باقی چھے دِن شہر سے باہر ملازمت میں گزرتے۔

عطیہ کا مزاج بہت دوستانہ تھا۔وہ جلد ہی سب سے گھل مِل جاتی تھی۔اس وجہ سے اس کی ماریہ سے بھی کافی دوستی ہوگئی تھی۔عطیہ اپنی شاگرد کو جہاں درس و تدریس کے لیے وقت دیتی۔وہاں کبھی کبھار شاہ صاحب کی الماری سے کتابیں نکال کر بھی پڑھ لیا کرتی تھی۔اِن کتابوں کو پڑھتے ہوئے ابتدا میں اُسے کچھ اجنبیت سی محسوس ہوئی بلکہ بعض باتیں بہت عجیب بھی لگیں لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اُس کی سوچ کو گویا ایک نیا راستہ مِل گیا۔اب وہ صرف کتابیں پڑھتی ہی نہ تھی بلکہ شاہ صاحب سے بعض سوالات بھی کرتی،جن کا جواب وہ نہایت شفقت سے دیتے۔

ایک دِن وہ ٹیوشن پڑھانے آئی تو سفید لباس میں ملبوس تھی اور اُس نے شاہ صاحب سے

درخواست کی کہ وہ مسلمان ہونا چاہتی ہے۔

سیّد صاحب نے ہر موڑ پر اس کی رہنمائی کی۔ اسلام قبول کرنے کے بعد اس کے گھر والوں نے اس پر تشدد کرنا شروع کر دیا۔ ان کا تشدد روز بروز بڑھتا جا رہا تھا اور وہ بہت پریشان رہنے لگی تھی۔ آخرکار اس کی گرتی ہوئی صحت کو دیکھتے ہوئے سیّد صاحب نے اس کو پناہ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ بات خطرے سے خالی نہ تھی۔ اس کے گھر والے ان پر بگڑ بھی سکتے تھے لیکن انھوں نے اپنے بیٹے سے اس سلسلے میں بات کی اور اس کی رضامندی حاصل کی اور اسے اپنے گھر لے آئے۔

وہ سارا دِن گھر کا کام کاج کرتی اور ماریہ کی پڑھائی میں اس کی مدد کرتی۔ سیّد صاحب کو وقت پر دوائی دیتی اور جب خالد چھٹی پر گھر آتا تو اس کا پورا خیال رکھنے کی کوشش کرتی۔ وہ اس کی خاموش شخصیت سے بہت متاثر تھی۔ وہ ان کے گھر میں اس قدر گھل مِل گئی کہ اب وہ اسے اپنا گھر سمجھنے لگی۔ ہر ایک کا بہت خیال رکھتی تھی۔

ایک روز عطیہ نے خالد کو اپنے ان جذبات سے آگاہ کیا۔ جو اِس کی محبت کے حوالے سے اس کے دِل میں موجزن تھے۔ ایسا کرتے ہوئے اُسے پہلے پہل جھجک محسوس ہوئی۔ لیکن جب اس نے خالد کی آنکھوں میں بھی اپنی طرف التفات کی چمک دیکھی تو اس نے اپنے دِل کا وہ سارا بوجھ ہلکا کر دیا۔ جو گزشتہ کئی ہفتوں کی خاموشی کی وجہ سے اس پر طاری تھا۔

ایک اتوار اُسے جب معلوم ہوا کہ کل سے خالد ایک ہفتے کی چھٹی پر گھر آ رہا ہے تو اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اس نے رات کو خصوصی کھانا تیار کیا۔ یہ سارا ہفتہ اس کے لیے بہت خاص تھا کہ اس کا چاہنے والا ہمہ وقت اس کے قریب تھا۔ ایک رات تو اسے چاند کی تنہائی پر بہت ترس آیا۔ یہ پورا چاند آج ان دونوں کو ایک ساتھ دیکھ کر گویا بہت ہی اُداس لگ رہا تھا۔

''خالد! تمھاری محبت میری زندگی ہے۔'' عطیہ نے آہستہ سے کہا۔

''اور عطیہ! تمھاری محبت میری زندگی ہے۔'' خالد نے عطیہ کا جملہ دُہرایا مگر قدرے اُونچی آواز میں۔

''آہستہ بولو۔ چاند سن رہا ہے۔''

''چاند نے تو بہت کچھ دیکھ بھی لیا ہے۔'' خالد نے کہا اور عطیہ کی آنکھوں میں قوسِ قزح کے رنگ بکھر گئے۔

''آج رات جو چاند نے سنا اور دیکھا۔ میں بہت جلد سورج کو بھی اُس سے باخبر کروں گا اور پھر ہماری قسمت کے ستارے بہم ہوں گے۔ بالکل ایسے جیسے میں اور تم۔۔۔ میں اور تم نہیں رہے ہم ہو

چکے ہیں۔''

عطیہ اس وقت بہت اداس ہوگئی۔ جب خالد اپنی ڈیوٹی پر جانے لگا۔ دوروز بعد سیّد صاحب کے گھر میں اُس وقت کہرام مچ گیا، جب یہ خبر آئی کہ خالد ڈاکوؤں کے ساتھ ایک پولیس مقابلے میں شہید ہو گیا ہے۔ ماریہ کی حالت بہت غیر تھی۔ عطیہ پر تو گویا دُکھوں کا ایک پہاڑ ٹوٹ پڑا لیکن سیّد صاحب بوڑھے ہونے کے باوجود عزم و استقلال کا پہاڑ ثابت ہوئے۔ جوان بیٹے کی موت کا دُکھ ایک طرف لیکن انھیں یہ فخر ایک نفسیاتی سہارا دیئے ہوئے تھا کہ وہ شہید کے والد ہیں۔

خالد کی شہادت کے بعد سیّد صاحب نے ماریہ کی شادی انتہائی سادگی سے کر دی۔ اب سیّد صاحب زیادہ تر وقت عبادت میں صرف کرتے لیکن کبھی کبھی ان کے منہ سے ایک ٹھنڈی آہ نکلتی کہ ان کا بیٹا دُنیا میں اپنی آخری نشانی بھی نہ چھوڑ کے گیا کہ ان کا شجرہ نسب ہی آگے بڑھتا۔ عطیہ کا بہت دِل چاہتا کہ وہ ان کے غم کے بوجھ کو ہلکا کرے مگر وہ چاہتے ہوئے بھی کچھ نہ کر سکتی تھی۔ خالد کی موت کے بعد اب جب ماریہ کی بھی شادی ہوگئی تھی گھر میں صرف سیّد صاحب اور وہی تھے۔ اس لیے اس نے گھر چھوڑ کر دارالامان جان کا فیصلہ کیا۔ ویسے تو سیّد صاحب اس کو اپنی بیٹی سے زیادہ پیار کرتے تھے۔ مگر وہ اس حقیقت سے بھی آشنا تھی کہ یہ معاشرہ ایسے ہمدردی کی رِشتوں کو زیادہ دیر تک ٹکنے نہیں دیتا۔

سیّد صاحب اس کے دارالامان جانے سے خوش تو نہ تھے مگر اس کے اٹل فیصلے کے آگے وہ مجبور ہو گئے اور اسے دارالامان جانے دیا۔ دارالامان والوں نے ہی اسے ایک فلاحی ادارے میں نوکری دلوادی۔

دارالامان میں آنے کے بعد تیسرے دِن اچانک رات کو سوئے ہوئے اس کا دِل گھبرانے لگا اور پھر نہ جانے کب بے ہوش ہوگئی۔ آنکھ کھلنے پر وہ ہسپتال میں تھی۔ ڈاکٹرز نے اس کی اس حالت کو جانچنے کے لیے اس کے کچھ ٹیسٹ کیے۔ جب اس کی رپورٹ آئی تو سب حیران رہ گئے اور وہ خود بھی سکتے میں آ گئی۔ رپورٹ اس کے سامنے تھی۔ مگر اسے کچھ دِکھائی نہ دے رہا تھا۔ بس پازیٹو کا ایک بڑا سا نشان اس کی آنکھ کی پتلی میں تیر کی مانند چبھا تھا۔ ادارے کی نیک شہرت بچانے کی خاطر دارالامان کی انتظامیہ نے اسے یہاں سے جلد از جلد جانے کو کہا۔

سیّد صاحب اس کو اپنی بیٹی سمجھتے تھے۔ اسے اس بات کا ڈر سچ بولنے سے روک رہا تھا کہ یہ نہ ہو اصلیت کھل جانے پر وہ سیّد صاحب کی نظروں سے گر جائے اور وہ اس کو قبول نہ کریں مگر یہ اس کے پیار کی آخری نشانی تھی۔ ان ہی سوچوں میں گم وہ کافی دیر پریشان رہی۔ یہی سوچتے سوچتے اس نے قلم اُٹھایا اور خط لکھنا شروع کیا۔

خط کیا تھا اس کی زندگی کا ایسا افسانہ تھا جسے لکھتے ہوئے اسے کئی بار ایسا محسوس ہوا کہ جیسے اس کی شمع حیات گل ہو جائے گی۔ آج وہ بہت بری طرح سے یادوں کی آگ میں جل رہی تھی۔ خط لکھتے ہوئے اسے یہ بالکل بھی معلوم نہ تھا کہ کیا وہ اس دُکھوں بھرے سفر سے آزاد ہو جائے گی۔ دراصل اس کی زندگی کی حقیقت ہی اِتنی تلخ تھی۔

سیّد صاحب جائے نماز پر بیٹھے عطیہ کا خط پڑھ رہے تھے۔ ان کے ہاتھ لرز رہے تھے اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

سیّد صاحب!

میرا یہ خط بہت ممکن ہے آپ کے اعتماد کو تکلیف پہنچائے یا آپ کی ذات کسی صدمے سے دوچار ہو، لیکن میرے پاس سوائے اِس کے اور کوئی راستہ نہیں کہ میں آپ کو حقیقت سے آگاہ کروں۔ دوسری صورت میں میرے پاس اور کوئی چارہ نہیں سوائے اس کے کہ میں خودکشی کرلوں لیکن ایسا میں اِس لیے نہیں کرسکتی کہ اب میری زندگی ایک اور وجود سے مشروط ہے اور اُس وجود کا تعلق آپ سے ہے۔

سیّد صاحب!

آج خالد اس دُنیا میں نہیں۔ خالد آپ کا بیٹا تھا مگر میری محبت۔ وہ لوگ کتنے سفاک کتنے بے رحم اور کتنے ظالم تھے، جنھوں نے میری محبت کے اَدھ کھلے پھول کو بڑی بے دردی سے مسل ڈالا تھا۔ میری ساری اُمیدیں میرے سارے سپنے کرچیوں کی مانند بکھر گئے تھے۔

سیّد صاحب!

جس دِن خالد آخری بار گھر سے گیا تھا تو اُسی رات ہم دونوں چاند کا نظارہ کرنے چھت پر تھے اور پھر آخری پہر نہ جانے کس لمحے ہم پر غفلت کی تاریکی چھا گئی۔۔۔ صبح کی پَوپھٹی تو ہم ایک دوسرے کو ندامت سے دیکھتے رہے مگر پھر خالد نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ جلد مجھ سے نکاح کرلے گا۔ لیکن وہ اگلے روز شہید ہو گئے۔

سیّد صاحب!

اِس وقت خالد کی نشانی میرے بطن میں ہے لیکن مجھے دارالامان

سے بدکرداری کے الزام کے باعث نکل جانے کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ بچہ آپ کے بیٹے کی بھی آخری نشانی ہے اگر آپ چاہیں تو بکھری کرچیاں سمیٹ سکتے ہیں۔''

آپ کی بیٹی

عطیہ

خط پڑھ کر سیّد صاحب نے مصلّٰے لپیٹا اور لرزتے قدموں دارالامان کی طرف روانہ ہوگئے۔

ooo

احتسابِ ذات

(رُباعیات)

—مامون ایمن، نیویارک—

وجدان سے معمور نظر رکھتا ہوں
خاموش نگاہی میں اثر رکھتا ہوں
مَیں بند ہوں اِک خول میں لیکن، مَیں تو
ماحول کی ہر آن خبر رکھتا ہوں

دولت کے اسیروں میں بھی رہ سکتا ہوں
بے نام فقیروں میں بھی رہ سکتا ہوں
رہ سکتا ہوں تعبیر کے رستوں میں بھی
خوابوں کے جزیروں میں بھی رہ سکتا ہوں

جھونکوں کی طرح خود کو اُڑا سکتا ہوں
ہنستے ہوئے، آنسو بھی بہا سکتا ہوں
سَر غیر کے آگے نہیں جھکتا میرا
ہستی کا تقاضا ہے، نبھا سکتا ہوں

تنظیم میں تحسین کا اندازہ ہوں
اِقرار میں انکار کا خمیازہ ہوں
منظر بھی ہوں ،مَیں دہر میں پس منظر بھی
خاموش سوالات کا آوازہ ہوں

دِن رات کا اِک عام سا منظر بھی ہوں
مرہم ہوں ، کسی زخم کا پیکر بھی ہوں
یہ دُنیا مرا گھر ہے ابد تک ، پھر بھی
دُنیا میں ازل ہی سے مَیں بے گھر بھی ہوں

ہستی کی پزیرائی میں تنہا بھی ہوں
دُنیا ہی میں عقبیٰ کا سراپا بھی ہوں
خودساختہ ہر زخم کا اِک دِن ، مَیں خود
اے کاش! کسی طور مداوا بھی ہوں

پنکچر

– گلزار سنگھ سندھو –

ترجمہ: حنیف باوا

تمام دِن کی تھکاوٹ کے بعد مخالف سمت سے آنے والی ہوا میں سائیکل چلاتا ہوا جب میں چوک میں پہنچا تو اُدھیڑ عمر کا ایک شخص لمبی تان کر پڑا ہوا مِلا۔ عمدہ کپڑے، اچھی صحت، کھاتے پیتے گھر کا دِکھائی دے رہا تھا۔ نزدیک جا کر دیکھا تو وہ مُردہ تھا۔ شائد کسی حادثے کا شکار ہو گیا تھا۔ دوسرے لوگ بھی ایک نظر اُس پر ڈال کر آگے بڑھ رہے تھے۔ مَیں نے بھی اپنی سائیکل کا ہینڈل دوسری طرف گھما دیا لیکن مجھے لگا کہ میرا یہ اقدام ٹھیک نہیں تھا۔ میں نیا نیا دہلی آیا تھا۔ مجھے تو دہلی والوں جیسا رویہ اختیار نہیں کرنا چاہیے تھا۔ مَیں نے بریک لگا کر سائیکل کو روک لیا۔ قریب جا کر دیکھا تو بوڑھا مرنے کے قریب پایا۔ مَیں نے سائیکل کو ایک طرف کھڑا کیا۔

''شائد شرابی تھا۔''

سونگھ کر دیکھا یہ بات بھی نہیں تھی۔

''ہوسکتا ہے مرگی کا مریض ہو۔''

میں ساتھ والی کوٹھی سے پانی کا گلاس لے آیا۔ میرے پیچھے پیچھے کوٹھی کی بوڑھی مالکہ بھی آ گئی۔ دیکھا دیکھی اور لوگ بھی وہاں رُکنے لگے۔

چند لمحوں میں وہاں کافی بِھیڑ ہو گئی، مجھے بھی تھوڑا سا حوصلہ ہو گیا۔ کوئی نبض ٹٹولنے لگا۔ کوئی دانتوں میں اُنگلیاں دے کر اُس کی دندل کھولنے لگا اور کوئی پشت کی جانب سے سہارا دے کر اُسے بٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''پانی۔۔۔'' اُس کے منہ سے نکلا۔

تمام کے تمام لوگ چوکس ہو گئے۔ میں نے فٹافٹ پانی کا گلاس اُس کے منہ سے لگا دیا۔ اُس نے ایک لمبا سانس لیا اور بولا ''دُودھ''

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ میرے قریب کوٹھی والی بڑھیا کھڑی تھی۔ شاید پانی پلانے کے بعد گلاس لینے کے لیے۔۔۔ وہ گھبرائی ہوئی تھی۔ وہ بھاگ کر دُودھ کا گلاس لے آئی۔

میں نے بڑھیا کے ہاتھ سے گلاس پکڑا اور اُس کے منہ کے پاس لے گیا۔ ایک مضبوط نوجوان نے سہارا دے کر اُسے بٹھایا۔ بے صبروں کی طرح بوڑھا دودھ کا گلاس غٹا غٹ پی گیا۔ اب اُس نے آنکھیں کھول کر اِدھر اُدھر دیکھا جیسے قریب کھڑے لوگوں کو پہچان رہا ہو۔ تمام نے سُکھ کا سانس لیا۔

ہر ایک یہی سمجھتا تھا جیسے اسی نے ہی مُردے میں جان ڈالی ہو۔۔۔ سہارا دینے والا نوجوان۔ ٹانگیں پکڑنے والا مزدور۔۔۔ دُودھ لانے والی بڑھیا اور سب سے پہلے پہنچنے والا میں۔۔۔ بوڑھے کو زندہ دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا جیسے ہم اُس کے پیدا کرنے والے ہوں۔۔۔ ربّ ہوں۔۔۔

مَیں بہت خوش تھا۔ مَیں سمجھتا تھا جیسے اُس کی جان میں نے ہی بچائی ہو۔ نہیں تو دہلی کے مصروف لوگ کب کسی کے پاس رُکنے والے تھے۔ زخموں پر مرہم تو کُجا وہ تو انھیں دیکھنے کے بھی روادار نہیں تھے۔ میرا دِل چاہ رہا تھا کہ مَیں ازخود ہی اپنے اس کارنامے کی چرچا کروں۔

''بھلا ہو بیٹا تیرا جس نے مُردے میں جان ڈال دی۔۔۔'' دودھ لانے والی مائی نے فیصلہ دیا اور دودھ والا برتن سنبھالتی ہوئی اپنی کوٹھی کی جانب چلی گئی۔ مَیں بہت خوش تھا۔

''اور کوئی خدمت بابا۔۔۔'' دو ماہ سے دہلی میں بے کار گھومتے ہوئے مشکل سے آج کا دِن کامیاب رہا۔ مَیں نے بوڑھے کی مزید مدد کرنے کی غرض سے پوچھا۔

''کچھ نہیں بیٹے۔ میری قسمت ہی کھوٹی ہے۔ مَیں بیٹے بیٹیوں والا ہوں۔۔۔ دو بیٹیاں ہیں جو بیاہ دی گئیں۔۔۔ بیٹے اپنے اپنے کام پر ہیں۔۔۔ ایک میرٹھ میں اور دوسرا بلند شہر میں ہے۔ مَیں بہوؤں کے رحم وکرم پر ہوں۔ چھ ماہ سے کھانے کو کچھ نہیں ملا۔ آج صبح جب تھوڑی سی اُونچی آواز میں بات کی تو انھوں نے مار پیٹ کر گھر سے نکال باہر کیا۔ جیب میں جو دو روپے تھے وہ کرائے میں چلے گئے۔۔۔ اب میں بھلا چنگا آ رہا تھا نہ جانے کیسے گر پڑا لیکن لوگ بہت اچھے ہیں۔۔۔ دُنیا میں نیک لوگوں کی کمی نہیں۔۔۔ مجھے پھول کی طرح دبوچ لیا آپ نے۔''

وہ پھیکی اور مُردہ سی آواز میں بولتا رہا۔

جہاں مجھے بابے سے دِلی ہمدردی تھی وہاں میں آج والے موقعے کے دستیاب ہونے کی

خوشی میں سرشار بھی تھا۔

''چلیں کہیں کسی دھرم شالا یا کسی گوردوارے میں چھوڑ آتا ہوں آپ کو۔''

''میں اپنے بیٹے کے پاس جانا چاہتا ہوں۔ اُس کے در پر ہی مرنے کی خواہش رکھتا ہوں۔''

''میں نے اُسے جنم دیا۔ پالا پوسا۔۔۔'' بوڑھے کی باتوں میں خودداری تھی، اَنکھ تھی۔ ماں باپ والی اپنائیت تھی۔

''تمھارا بیٹا کہاں رہتا ہے۔'' مَیں نے اُس سے پوچھا۔

''میرٹھ میں چھوٹے بیٹے کے پاس پہنچ جاؤں بس اتنا ہی کافی ہے۔''

''میرٹھ کا کتنا کرایہ ہے۔۔۔'' میں اپنی حیثیت سے بڑھ کر اُس کی مدد کو تیار تھا۔

''یہی کوئی دو اڑھائی روپے۔ اٹھنّی اسٹیشن تک جانے کے لیے اور آٹھ آنے کھانے پینے کے لیے۔''

صرف تین چار رُپوؤں کی بات تھی۔ لیکن پیسوں کی بات سنتے ہی لوگ نہ جانے کہاں غائب ہو گئے۔ اُس وقت میری جیب میں صرف دو روپے تھے۔

''ایک روپیہ میرے پاس بھی ہے۔۔۔'' مجھے تذبذب میں دیکھ کر مجھ سے زیادہ غریب ہمدرد نے کہا۔

''تین روپے مِل سکتے ہیں آپ کو۔۔۔'' میں نے بوڑھے کی طرف دیکھا۔

''اتنے ہی کافی ہیں بیٹا۔۔۔ میں نے کونسا محل تعمیر کرنا ہے۔ دُودھ نے پیٹ کو بہت سہارا دیا ہے۔ اسٹیشن تک پیدل ہی چلا جاؤں گا۔۔۔'' اتنا کہتے ہوئے بوڑھے نے ہم سے وہ تین روپے لیے اور انھیں جیب میں ڈال کر اُٹھ کھڑا ہوا۔۔۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے دُودھ اور رُپوؤں نے مُردے میں جان ڈال دی ہو۔ دہلی میں رہتے ہوئے آج یہ پہلا دِن تھا جب کسی نے مجھے احسان مند نظروں سے دیکھا۔۔۔ اتنی بے بضاعتی اور اتنی کم ہمتی سے اتنا بڑا احسان، مجھے لگا جیسے میں نے دِلّی کو فتح کر لیا ہو۔

خوشی میں پُھولا نہ سماتے ہوئے جب میں گھر جانے کے لیے سائیکل پر سوار ہوا تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ان چند ساعتوں نے ہوا کا رُخ ہی بدل کر رکھ دیا ہو۔۔۔ اب ہوا سامنے سے آنے کی بجائے سائیکل کو پیچھے سے دھکا لگا رہی تھی۔۔۔ اب سائیکل اس قدر رواں ہو گئی تھی جیسے ٹائروں میں ایک ننھا سا بھوت گھس گیا ہو۔ جو اِنھیں اس پختہ اور گول سڑک پر بڑی تیز رفتاری سے دھکیلتا ہوا لے جا رہا ہو۔

''بیچارا دُکھی بابا۔۔۔'' میں نے اپنی خوشی میں حصہ دار بنانے کے لیے ایک سائیکل والے

لڑکے سے کہا۔

''کوئی دُکھوُ کھ نہیں جی اس کو۔''

اُس کا جواب سن کر میں اپنے گھر کی جانب جانے والی گلی کا موڑ نہ مُڑ سکا وہیں پر رُک گیا۔

''یہ بڑا پاکھنڈی ہے۔ دِلی کا ہی رہنے والا ہے۔ کھاری باوَلی میں اس کی پھلوں کی دُکان ہے۔ اچھی بھلی کمائی ہے اس کو۔ جسے وہ اپنے بیٹے بیٹیوں پر خرچ کر دیتا ہے۔ گھر دیکھو ڈاک بنگلے کی مانند ہے۔''

لڑکے کی بات سنتے ہی میرا تمام نشہ اُتر گیا۔

''اس طرح بے ہوش ہونا اس کا روز کا معمول ہے۔۔۔'' وہ بولتا گیا۔۔۔'' جیسے ہی شام کے دُھند لکے پھیلنے لگتے ہیں۔ وہ کبھی اس سرے پر گر جاتا ہے کبھی اُس پر۔ یہ اس کی اضافی کمائی ہے۔''

لڑکا بوڑھے کا واقف کار لگتا ہے۔

''ہماری کالونی میں ہی اس کا ٹھکانا ہے۔ یقین نہ آئے تو چلو میرے ساتھ چل کر دیکھ لو۔''

اپنے وجود کا سارا بوجھ کبھی دائیں اور کبھی بائیں پیڈل پر ڈالتا بائی بائی کہتا ہوا وہ سکولی لڑکا دائیں ہاتھ والی گلی میں چُھپ گیا۔

اپنی کم علمی کے بارے سوچتا ہوا میں اپنے گھر کا موڑ بہت پیچھے چھوڑ آیا۔ گھر سے ڈیڑھ میل کی دُوری پر شش و پنج کی حالت میں مَیں نے سائیکل کا اگلا پہیہ گھٹنوں میں دبایا اور دونوں ہاتھوں سے اس کے ہینڈل کو اس طرح سیدھا کرنے لگا جیسے یہ بوڑھے کے گرنے والی جگہ پر کھڑا کھڑا ہی ٹیڑھا ہو گیا ہو۔

پھر جب میں سائیکل کا منہ موڑ کر واپسی کا سفر طے کرنے کے لیے اُس پر سوار ہو تو مجھے لگا جیسے میری سائیکل کے دونوں ٹائر پنکچر ہو گئے ہوں۔ اب میں اُس خالی سائیکل کو گھسیٹ کر بھی گھر نہیں پہنچا سکتا تھا۔

(پنجابی سے ترجمہ)

ooo

غزلیں

—بیدل حیدری—

کسی تو آئینہ گر کی دُکاں سے آیا ہے
تمھارے ہاتھ پہ چہرہ کہاں سے آیا ہے
اِسی زمین سے یا آسماں سے آیا ہے
یہ ہجرتوں کا تصور کہاں سے آیا ہے
مری نگاہ میں بستی کے سب دریچے ہیں
میں جانتا ہوں یہ پتھر جہاں سے آیا ہے
یہ شخص کتنا پرستار ہے صداقت کا
ہماری صف میں صفِ دُشمناں سے آیا ہے
بہت قدیم ہے تخلیق کا ہنر بیدلؔ
ہمارے پاس بھی یہ رفتگاں سے آیا ہے

○○○

میری غربت نے تنگ دستی میں
بیچ ڈالا مجھے بھی ردّی میں
حسرتوں کے مزار بھی کیا ہیں
جیسے قبریں غزا کی پٹی میں
روز پِستا ہوں صورتِ گندم
آسمان و زمیں کی چکی میں
سوئے کے سوئے رہ گئے آنگن
پھر گیا رات کون بستی میں
وہ ابھی محوِ خواب ہے بیدلؔ
اور ہوا جاگتی ہے کھڑکی میں

○○○

دیکھ لو گے ، ابھی دیکھا کیا ہے
تم نہیں جانتے ، دُنیا کیا ہے
یہ ترے ہاتھ میں لرزہ کیا ہے
اے بھکاری ! ترا قصہ کیا ہے
جیسے دیمک زدہ لکڑی کا مکان
غم نے انسان میں چھوڑا کیا ہے
ڈال جاتا ہے کوئی خاک میں جان
ورنہ یہ خاک کا پُتلا کیا ہے
مانگنے والا تو بن ، بعد میں دیکھ
دینے والا تجھے دیتا کیا ہے
کسی مقتول کا سر لگتا ہے
دیکھنا! طشت میں رکھا کیا ہے
دفن ہے قبر میں بندہ کوئی اور
اور تعویز پہ لکھا کیا ہے
خود نہیں چھوڑتا بیدلؔ میں یہ شہر
ورنہ اس شہر میں میرا کیا ہے

غزل

—انور شعور—

لاکھ محروم ہوں خوشی سے ہم
پیار کرتے ہیں زندگی سے ہم

''موت کا ایک دِن معین ہے''
کیوں پریشان ہوں ابھی سے ہم

کھوئے رہتے ہیں اپنے آپ میں وہ
بیٹھے رہتے ہیں خامشی سے ہم

جینے دیتا نہ مرتے دیتا ہے
تنگ آئے ہوئے ہیں جی سے ہم

دوستوں کی کمی نہیں لیکن
کوئی ہم سے خفا، کسی سے ہم

شام سے قبل آ گئے پینے
تیز رفتار ہیں گھڑی سے ہم

ناتوانی کے باوجود شعورؔ
جی رہے ہیں بہادری سے ہم

غزلیں

–صابر ظفر–

آسمانوں کی طلب میں بے زمیں رہ جائیں گے
دیکھنا ہم تم کہیں کے بھی نہیں رہ جائیں گے
اِس علاقے میں نمائش کی نہیں کوئی جگہ
گوشۂ دِل میں فقط گوشہ نشیں رہ جائیں گے
مختلف سمتوں میں سیلابِ فنا لے جائے گا
تم کہیں رہ جاؤ گے اور ہم کہیں رہ جائیں گے
خاک داں آباد ہوں گے اور اُجڑ جائیں گے شہر
خاک میں سوئے ہوئے سارے مکیں رہ جائیں گے
جذب کر لے گا یہ صحرا سب نمی اپنی ظفر
ہم کسی بھی لہر میں ہوں گے یہیں رہ جائیں گے

ooo

یہ جو بگولہ بنجارہ ہے، یہ جو بھنور آوارہ ہے
اپنے آپ میں صحرا ہے یہ، اپنے آپ میں دریا ہے
کوئی غیر تو ہو نہیں سکتا، اپنا ہے وہ کوئی ضرور
کھینچ کے میرا دِل سینے سے، ساتھ اپنے لے جاتا ہے
میری طرح تو خیر نہیں ہے، لگتا ہے وہ میری طرح
اپنے آپ کو توڑ رہا ہے، شاید وہ بھی اکیلا ہے
ساتھ جو ہوگا، ہوگا ادھورا، سپنا کیا ہوگا پورا
عکس کو جوڑنا مشکل ہوگا، ٹوٹا ہوا آئینہ ہے
صابر اُس کی آوازوں کے ساتھ کہاں تک جاؤ گے
وہ تو گہری خاموشی ہے، وہ تو اِک سناٹا ہے

ooo

غزلیں

—ڈاکٹر صفی حسن—

کوئی ہو گی کہیں آوارہ صدا رات گئے
کون آئے گا مرے گھر میں بھلا رات گئے
میری سانسوں میں اُتر موجۂ خوشبو کی طرح
ایسے تنہا نہ مجھے چھوڑ کے جا رات گئے
پھر ہوا نے کہیں روتے ہوئے ہچکی لی ہے
ٹمٹمایا ہے کہیں کوئی دِیا رات گئے
کتنے سوئے ہوئے جذبات نے انگڑائی لی
اُس نے کیا کھول دیے بندِ قبا رات گئے
دُور اِک درد بھری چیخ سنائی دی ہے
ہو گیا کون اسیری سے رِہا رات گئے
صبح کے اور تقاضے تھے صفی کل کی طرح
اب کسے یاد ہے کیا کس نے کہا رات گئے

ooo

ریزہ ریزہ یوں تو ہوئے ہیں شیشے میرے خوابوں کے
پھر بھی اِن میں جاگ رہے ہیں کتنے رنگ چراغوں کے
گرتے پڑتے اُس نے بھی تو آخر چلنا سیکھ لیا
ڈھونڈ رہا تھا وہ جو سہارے کل تک تیری بانہوں کے
کچھ تو محبت کی قیمت ہر دِل کو چکانی پڑتی ہے
تیری طرح میں نے بھی سنے ہیں کتنے طعنے لوگوں کے
میری خاطر اپنی روشن صبحوں کو برباد نہ کر
دیکھ تری راہوں میں کھلے ہیں کتنے پھول گلابوں کے
آج بھری محفل میں اُس نے حال نہ پوچھا، بات نہ کی
ایک ہی پل میں توڑ دیے سب اُس نے مراسم برسوں کے
آج وہ مجھ سے پوچھ رہے ہیں دردِ محبت کیا ہے صفی
میں نے کل پلکوں پہ چنے تھے کانٹے جن کی راہوں کے

غزل

—ڈاکٹر صابر آفاقی—

موسم آیا ہے جو اب سرد کہاں جائے گا
رنگ ہے باغ کا جو زرد کہاں جائے گا

قصرِ بلقیس کی ہر خشت ہے رشکِ خورشید
تو مسافر ہے لیے گرد کہاں جائے گا

کھیل بچوں کا نہیں کوئے بتاں میں جانا
مرد ہی جائے گا نامرد کہاں جائے گا

تو چلا ہے کہ مئے درد ، مداوا ہو جائے
بڑھ گیا اور اگر درد کہاں جائے گا

اختیار اتنا جماعت کو نہ دینا لوگو
فرد کی فکر کرو فرد کہاں جائے گا

تیرا جانا تو نہیں مسئلہ کوئی صابرؔ
مسئلہ درد کا ہے درد کہاں جائے گا

غزل

–سعید احمد اختر–

وہ کشمکش میں تھا ٹھہرے، کہ چل پڑے گھر سے
کہ اتنی دیر میں پانی گزر گیا سر سے

میں اپنے کھیت میں اب فصل ہی نہیں بوتا
مری بلا سے وبا آئے یا گھٹا برسے

نہیں تھی عقل سو پیاسوں کو میٹھے پانی کا
مِلا نہ ایک بھی قطرہ بھرے سمندر سے

کرایہ کم تھا گلی بھی سفید پوشوں کی تھی
وہ کاش دیکھ تو لیتے مکان اندر سے

لگی ہے فکر یہ نورنگ رس بھرا جوبن
چھلک نہ جائے کسی روز تیری گاگر سے

وہ میں تھا، تم تھے کہ تجدید رسم کی خواہش
صدائیں مستقلاً آ رہی تھیں اندر سے

سعیؔد زندگی وہ کم شعور بیوی ہے
تمام عمر جو راضی ہوئی نہ شوہر سے

○○○

غزلیں

–یاد صدیقی–

ترے یقین نہ میرے گماں کی زد پر ہے — زمیں ازل سے اسی آسماں کی زد پر ہے
تغیراتِ شنیدہ و دیدہ اپنی جگہ — یہ کائنات مری داستاں کی زد پر ہے
ذرا سے عدم توازن سے مٹ بھی سکتا ہے — کہ یہ نظام کسی مہرباں کی زد پر ہے
یہ سوچ کر میں ہر اِک کہکشاں سے لوٹ آیا — یہ کہکشاں بھی کسی کہکشاں کی زد پر ہے
ذرا اے جذبۂ تسخیرِ کائنات ٹھہر — کہ زندگی ابھی سود و زیاں کی زد پر ہے
زمیں پہ اُن کی کوئی بدحواسیاں دیکھے — جو کہہ رہے تھے کہ ایسی کہاں کی زد پر ہے
وطن کی خاک کو آسودگی ملے کیسے — کبھی مکاں تو کبھی لامکاں کی زد پر ہے
سنا کیے تھے جو بچپن میں اب بھی سنتے ہیں — یہ سرزمیں کسی دستِ نہاں کی زد پر ہے

○○○

وہ معترف مرے اخلاص کا تو یوں بھی ہے — کہ اُس کا چہرہ پسِ آئینہ تو یوں بھی ہے
دِل آج شام ہی سے تیرا ذِکر لے بیٹھا — چلو یہی سہی شب کاٹنا تو یوں بھی ہے
کہ جیسے ہم نے نہیں صرف تو نے چاہا ہے — تری نوشت میں کچھ تذکرہ تو یوں بھی ہے
ضرورتاً بھی کبھی خود سے مِل نہیں پاتے — نوازشوں کا تری سلسلہ تو یوں بھی ہے
بدن کی لہریں بدن تک پہنچ ہی جاتی ہیں — نگاہ ساتھ نہ دے رابطہ تو یوں بھی ہے
یہ چاندنی سب ہی گوشوں سے دُور رہتی ہے — سیاہ رات مرا مسئلہ تو یوں بھی ہے
کبھی کبھی تو ہوائیں بھی تھک سی جاتی ہیں — دیئے جلانے کا کچھ حوصلہ تو یوں بھی ہے
میں اپنی نفی یہی سوچ کر تو کرتا ہوں — مرے وجود میں اِک دوسرا تو یوں بھی ہے
میں اِتنا چیخوں کہ سب بے صدا سے ہو جائیں — کبھی کبھی مرا دِل چاہتا تو یوں بھی ہے
ہیں آج صبح سے آثار دِل پہ شب خوں کے — سو آج رات ہمیں جاگنا تو یوں بھی ہے

غزلیں

—ارشاد جالندھری—

کہتے ہیں وہ غریب کو صدقے کا مال دو
یوں دیس کی حدود سے غربت نکال دو

آیات اور حدیث کے معنی ہیں جس قدر
سب اپنے ہی مفاد کے سانچے میں ڈھال دو

جائز قرار دیجیے زردار کی یہ لوٹ
اور مفلسوں کو صبر کی تلقیں پہ ٹال دو

پھر ورغلاؤ قوم کو مذہب کے نام پر
پھر خاک پوری قوم کی آنکھوں میں ڈال دو

اب ماضیٔ بعید نہ آئے گا لوٹ کر
تم اس خیال خام کو دِل سے نکال دو

زندہ رہے غریب تو سوئے برہنہ تن
زردار مر بھی جائے تو میّت پہ شال دو

ارشادؔ انقلاب کی ہے آرزو تو پھر
ہر تاجور کے تاج کو اُوپر اُچھال دو

○○○

بتائیں کس طرح ہم اس لیے رہتے ہیں گم صم سے
نہیں جرأت کہ یہ کہہ دیں محبت ہے ہمیں تم سے

تمہاری آنکھ اور چہرے کی ہو منظر کشی کیسے
بہرصورت یہ ہیں بڑھ کر یقیناً ماہ و انجم سے

یہ طرزِ گفتگو ہی پیش خیمہ ہے بہاروں کا
ہزاروں پھول جھڑتے ہیں تمہارے اِک تکلم سے

یہ ممکن ہی نہیں طاری نہ ہو پھر وجد محفل پر
غزل تو ہو مری لیکن سناؤ تم ترنم سے

محبت کے سمندر میں قدم رکھا تو کیا غم ہے
اُنھیں موجوں کا ڈر کیا ہے جو کھیلے ہوں طلاطم سے

بہار اس پر ہے خود شاہد کلی کو ناز ہے اس پر
چٹکنے کی ادا پائی تمہارے ہی تبسم سے

نہ یوں ارشادؔ کو دیکھو نہیں معلوم یہ تم کو
کہ دِل پر کیا گزرتی ہے نگاہوں کے تصادم سے

○○○

غزلیں

–جمشید مسرور–

تمھارے شہر کا ابر بہار کیسا ہے
گھرا ہوا مری جاں پر غبار کیسا ہے

لگی جو نقب تو اِک اُونگھ چھا گئی ہر سُو
میان دزد و سگاں اعتبار کیسا ہے

فراز دار تک اس کی نظر نہیں جاتی
وہ فتح یاب ہے اور شرمسار کیسا ہے

سوادِ دہر خدایاں میں رہ کے سوچتا ہوں
مرا قبیلۂ بے اختیار کیسا ہے

فصیلِ شہر گرا دی ہے شہر والوں نے
غنیمِ شہر تجھے انتظار کیسا ہے

ہجومِ نعرہ زناں قصرِ شہ تک آ تو گیا
بریدہ بازو و سینہ فگار کیسا ہے

سنا رہا ہے رجز اہلِ قریہ کو جمشید
یہ کشتگاں میں اکیلا سوار کیسا ہے

ooo

پہلے احسان سفینے کا اُتارا جائے
پھر وہاں جائیں جہاں تک کہ کنارا جائے

حاکم شہر نے رکھا ہے خیال اب کے برس
جسم مصلوب نہ ہوں سوچ کو مارا جائے

خوش جمالوں کے در و بام ہوئے دور ایسے
نہ وہاں لفظ ہی پہنچیں نہ اشارا جائے

اپنی نسلوں کے لیے دید کی صورت ہے یہی
آ شبِ عمر کو آنکھوں میں گزارا جائے

برف کے پیڑ مرے، برف کے دریا میرے
دُور تک ان میں کوئی دھوپ کنارا جائے

چاندنی جرم ہے گر قریۂ شب میں جمشیدؔ
چاند پھر آج مری چھت پہ اُتارا جائے

غزلیں

–قائم نقوی–

کہنے کو تو اس عہد کے معمار ہمی ہیں — ہر راہ مگر راہ کی دیوار ہمی ہیں
وہ جن کی چھتوں پر کوئی سورج نہیں کھلتا — اُن زرد مکانوں کے خریدار ہمی ہیں
کیوں ایک دھماکے میں نہ آ جائیں زمیں پر — بنیاد سے نکلے ہوئے مینار ہمی ہیں
پھر صبر کی اینٹوں میں نہ چھپ جائیں یہ گلیاں — اس شہرِ ستم کے در و دیوار ہمی ہیں
پھر شب کی سیاہی میں دمکنے لگے تارے — اے شب ترے دھبوں کے گنہگار ہمی ہیں
ہم اپنا لہو اپنی ہی گردن پہ نہ لیں گے — ہر چند ترے ہاتھ کی تلوار ہمی ہیں

ہم کو کسی آذر نے تراشا نہیں لیکن
اے وقت ترے کفر کا پندار ہمی ہیں

OOO

دفیں بجیں تو باقی کوئی ڈر نہیں دیکھا — کتنے تنوں پر ایک گھڑی میں سر نہیں دیکھا
منزل پانے کی اَن دیکھی خواہش میں — اِک مُدّت سے ہم نے اپنا گھر نہیں دیکھا
چلتے پھرتے بے حس لاشے دیکھے ہیں — شہر نا پُرساں میں نوحہ گر نہیں دیکھا
دھاگہ دھاگہ ریشم جال میں سمٹا ہوں — اِک ایسی دیوار ہے جس میں در نہیں دیکھا

چاند رُتوں میں ملنا ہجر کے ماروں کا
دیکھنے والوں نے بھی ایک نظر نہیں دیکھا

OOO

غزل

—حسن عباس رضا—

غم ایک رات کا مہمان تھوڑی ہوتا ہے
کہ اس کے جانے کا اِمکان تھوڑی ہوتا ہے

ہزار طرح کے روگ اس کے ساتھ آتے ہیں
یہ عشق بے سر و سامان تھوڑی ہوتا ہے

تمہیں جو دیکھنے ہم آ گئے تو حیرت کیوں
خود اپنے آپ پہ احسان تھوڑی ہوتا ہے

جس ایک حرفِ طلب پر دِل آ کے جھکتے ہوں
وہ بادشاہ کا فرمان تھوڑی ہوتا ہے

یہ دُکھ تو چپکے سے آ بیٹھتے ہیں سینوں میں
کہ ان کے آنے کا اعلان تھوڑی ہوتا ہے

عذاب ہوتا ہے اُن کے لیے جو سوچتے ہیں
بتانِ سنگ کو سرطان تھوڑی ہوتا ہے

رہِ وفا میں کہاں فاصلوں کو ماپتے ہیں
عیارِ عشق میں میزان تھوڑی ہوتا ہے

محبتیں تو فقط نقدِ جاں ہی مانگتی ہیں
یہاں پہ مال کا تاوان تھوڑی ہوتا ہے

کمال یہ ہے کہ میں نے بھلا دیا اُس کو
وگرنہ کام یہ آسان تھوڑی ہوتا ہے

اسے تو مجنوں و فرہاد ہی سے نسبت دو
یہ عشق خسرو و خاقان تھوڑی ہوتا ہے

کچھ اہلِ زر، سرِ بازار آئے ہیں، لیکن
ضمیر، نیلم و مرجان تھوڑی ہوتا ہے

میں تار تار تو کر دوں حسنؔ زمانے کو
مگر یہ میرا گریبان تھوڑی ہوتا ہے

ooo

غزل

-ترغیب بلندؔ-

محبت کی عجب دھڑکن ہے دِل میں
یہ کس کے پیار کی اُلجھن ہے دِل میں

منور ہے اسی سے جسم سارا
ستارہ سا کوئی روشن ہے دِل میں

بہت سے عکس ہیں اس میں تمہارے
کہ اِک بے داغ سا درپن ہے دِل میں

مہک جس کی ہے جان و دِل میں مرے
یہ کس کے حسن کا گلشن ہے دِل میں

ہو شاید ربط اِس کا موجِ خوں سے
مسلسل یہ جو ایک دھڑکن ہے دِل میں

شبِ غم کون یاد آنے لگا ہے
یہ کیسا نالہ و شیون ہے دِل میں

کبھی تو چلچلاتی دھوپ سی ہے
کبھی بھادوں کبھی ساون ہے دِل میں

تمھی تو جلوہ گر ہو اِس میں پیارے
تصور کی جو یہ چلمن ہے دِل میں

خیالِ یار کی تاثیر دیکھو
مہکتا جیسے اِک گلشن ہے دِل میں

یہ حسن و عشق کے موسم عجب ہیں
اُدھر دھوپ اور اِدھر ستون ہے دِل میں

یہ لگتا ہے بہت سادہ سا لیکن
بسا اِک شہرِ علم و فن ہے دِل میں

حیات اپنی ہے دھڑکن اور لہو سے
انھی دونوں کا اِک بندھن ہے دِل میں

زمینِ کربلا یاد آ رہی ہے
یہ کیسا خیر و شر کا رن ہے دِل میں

اندھیرے کی مجھے پروا نہیں ہے
جمالِ دِل رُبا روشن ہے دِل میں

نگاہِ عشق کا اعجاز ہے یہ
کسی کی جستجو روشن ہے دِل میں

میں کس کس کا کروں اب ذکر ترغیبؔ
تمناؤں کا اِک مسکن ہے دِل میں

غزل

—نذر جاوید—

اوجھل ہے گرچہ ابتدا آخر کی آنکھ سے
لیکن چھپے گی کب تلک ناظر کی آنکھ سے

مَیں اُس میں ڈھونڈتا رہا اثبات کا جواز
وہ مجھ کو دیکھتا رہا منکر کی آنکھ سے

تحریر میں سمیٹتے کیا حاصلِ نظر
باطن اُلجھ کے رہ گیا حاضر کی آنکھ سے

رختِ سفر ہوئی ہے ستاروں کی جستجو
رستے پلٹ رہے ہیں مسافر کی آنکھ سے

جس شے پہ بھی نظر پڑی آئینہ ہو گئی
دیکھا ہے کائنات کو شاعر کی آنکھ سے

غزل

—مقصود وفا—

نام کو گمنام کرنے آ گئے
پختہ کاری خام کرنے آ گئے

جس گلی میں صبح نہ آئی ہمیں
اُس گلی میں شام کرنے آ گئے

شکریہ ! بے کار جاتی زندگی
ہم کو بھی کچھ کام کرنے آ گئے

وہ جنھیں تہذیبِ خواہش تک نہیں
عاشقی میں نام کرنے آ گئے

عمر صرفِ خواب کر دی اور اب
خواب کو نیلام کرنے آ گئے

خاص لوگوں کے لیے ہے شاعری
ہم صلاء عام کرنے آ گئے

غزلیں

—طارق ہاشمی—

پھر کسی قریۂ ہجرت سے مجھے دیکھتا ہے
عشق اب کون سی غایت سے مجھے دیکھتا ہے

کوئی پیغامِ مسلسل ہے مری خاک کے نام
اک ستارہ بڑی مُدّت سے مجھے دیکھتا ہے

کس کو سمجھاؤں شبِ تار میں دِل کی مشکل
چاند بھی اپنی سہولت سے مجھے دیکھتا ہے

عین ممکن ہے سمندر کو بلا لوں میں بھی
شہر کا شہر رعونت سے مجھے دیکھتا ہے

ایسی وحشت ہے اِن آنکھوں میں کہ اب صحرا کا
جو بھی ذرّہ ہے عقیدت سے مجھے دیکھتا ہے

کیسا آئینہ ہوں ، حیران نہیں ہوں طارقؔ
دیکھنے والا بھی حیرت سے مجھے دیکھتا ہے

ooo

قلم کباڑ میں ، دے دی کتاب ردّی میں
فروخت کر دیے آنکھوں نے خواب ردّی میں

عجب نہیں جو مرا حرف بھی ہے بے توقیر
سخن پڑے ہیں یہاں بے حساب ردّی میں

کچھ اِس طرح دیا ترتیب عاقبت کا گھر
گناہ شیلف پہ رکھے ثواب ردّی میں

میں اب کی بار جو اخبار پھینکنے کو گیا
عجب دِکھائی دیا اضطراب ردّی میں

مہک رہے ہیں عجب طور فالتو کاغذ
کسی نے پھینکے ہوں جیسے گلاب ردّی میں

حیات و موت کی ردّ و قبول میں ہے جو پیر
گزارا کوڑے پہ بچپن شباب ردّی میں

تمام شہر میں طارقؔ بڑی تلاش کے بعد
میں خود کو ہو ہی گیا دستیاب ردّی میں

ooo

غزل

—خاور جیلانی—

ہو نہ ہو ، ہوں ضرور ، میں جو ہوں
کم نہیں یہ قصور ، میں جو ہوں

میں عبارت ہوں اِس عبارت سے
اِس کے بین السطور میں جو ہوں

دُور مت جائیے مرے دِل سے
آپ کے دِل سے دُور میں جو ہوں

ہے! کوئی شخص جو ہے میرا غرور!
اس قدر پُر غرور میں جو ہوں!

اس طرح ہی خراب و خستہ کہیں
ہو گا وہ بھی ضرور ، میں جو ہوں

یہ تڑپ اور ہُما شُما کے لیے؟
اس سزا کو حضور میں جو ہوں!

کس لیے کرچیاں چنے ، اُس کے
سامنے چور چور میں جو ہوں

اب تو خیر اپنی تشنہ کامی سے
لے رہا ہوں سرور ، میں جو ہوں

غزل

— کمال وارث خان—

دُکھ غیر کو دینا بھی گوارا نہیں کرتے
برتاؤ کسی طور بھی ایسا نہیں کرتے

فطرت ہی میں ہم سخت ہیں دھوکے کے مخالف
یعنی کبھی دھوکے سے بھی دھوکا نہیں کرتے

جو لوگ ہیں آسودہ و بے فکرِ مسائل
کیوں وہ کبھی عزمِ درِ کعبہ نہیں کرتے

لہرا کے یہی کہتا ہے ہر رندِ بلانوش
جو رند ہوں باظرف وہ بہکا نہیں کرتے

جس غم کو ترے نام سے ہو جاتی ہے نسبت
بھولے سے بھی اُس غم کا مُداوا نہیں کرتے

ہم اہلِ ادب ہیں ، ہمیں خود پاسِ ادب ہے
ہو جاتے ہیں رسوا ، اُسے رسوا نہیں کرتے

کیوں اِن کو کتابوں میں سجا رکھا ہے تم نے
مرجھائے ہوئے پھول تو مہکا نہیں کرتے

ہیں آرزوئیں دِل میں کمالؔ اپنے بھی ، لیکن
ہم عشرت بے جا کی تمنا نہیں کرتے

غزلیں

—شہاب صفدر—

زخم کو پھول کا ثانی بھی سمجھ سکتے ہو
دُکھ محبت کی نشانی بھی سمجھ سکتے ہو

قتل میرا ، مری قسمت کا لکھا ٹھہرا کر
موج زن خون کو پانی بھی سمجھ سکتے ہو

دوست داری میں وہ اخلاص بھرا دل ہوں جسے
دوستو دُشمنِ جانی بھی سمجھ سکتے ہو

عجزِ اظہار ہے عریاں کو بھی عریاں کہنا
گو اِسے سادہ بیانی بھی سمجھ سکتے ہو

سیلِ منظر میں ہے جو دلّی کی تصویر اُس کو
پارۂ دِل کی روانی بھی سمجھ سکتے ہو

یہ بھی کہہ سکتے ہو تڑپا یا نئے غم نے مجھے
اور کوئی چوٹ پرانی بھی سمجھ سکتے ہو

معنوی سچ سے ہوا احساسِ ندامت تو شہابؔ
تم کہانی کو کہانی بھی سمجھ سکتے ہو

○○○

ترک آئنے سے رسمِ ملاقات نہیں کی
اِک عمر مگر خود سے کوئی بات نہیں کی

دیکھے ہیں اگر خواب تو اوقات میں رہ کر
بندے نے کبھی گھر سے پرے رات نہیں کی

اُس پھول نے ہر جھونکے کو خوشبو سے نوازا
کس دوست کے ہمراہ یہ سوغات نہیں کی

قارون سے بڑھ کر ہی وہ بے فیض کہ جس نے
اِک حرفِ تسلی کی بھی خیرات نہیں کی

کہتے رہے تارے نہیں بے وجہ یہ چھل بل
اور چاند نے تردیدِ بیانات نہیں کی

پہلے سے زیادہ ہے بہر دم تپشِ غم
ایام نے سرد آتشِ حالات نہیں کی

اَن پڑھ تھے شہاب اس لیے دیوارِ اَنا پر
چسپاں سندِ فخر و مباہات نہیں کی

غزلیں

–محسن شکیل–

کوئی تدبیر ردِّ قتالِ بشر اے حسن کوزہ گر!
کچھ نہیں بن سکا چاک پہ گھوم کر، اے حسن کوزہ گر

اے حسن کوزہ گر جانتے ہیں سبھی تیری فردِ عمل
تیرا شہرِ حلب، اس کے دیوار و در اے حسن کوزہ گر

بابل و نینوا، میرا شہرِ نجف ، دجلہ و کربلا
گھومتے ہیں سبھی تیرے اِس چاک پر، اے حسن کوزہ گر

ایک تہذیبِ کہنہ بہ منسوبِ دِل یا نظامِ ستم
شہرِ بغداد میں کون ہے دار پر، اے حسن کوزہ گر

کوئی سنتا نہیں اور سمجھتا نہیں اِس کے معنے ہیں کیا
زد پہ آئے ہوئے فاختاؤں کے پر، اے حسن کوزہ گر

لٹ گئے شہر کیسے یہ ویراں ہوئے دیکھ لو پوچھ بھلا
ایک سسی یہاں، تو وہاں بے خبر اے حسن کوزہ گر

تیرے قریے میں اُڑتی ہوئی گرد ہوں، میں ترا درد ہوں
اے حسن کوزہ گر، اے حسن کوزہ گر، اے حسن کوزہ گر

وقت کا فیصلہ ، کیا ہوا ، کیا نہیں شہرِ بغداد کو
جانتے ہیں سبھی لگ گئی ہے نظر، اے حسن کوزہ گر

○○○

تمام شہر ہے تاریکیاں بچھانے کو
اور ایک میں ہوں برابر دِیا جلانے کو

یہ کیا ہوا کہ زمانہ بدلتا جاتا ہے
یہ کیا ہوا ہے مرے وقت میں زمانے کو

بس ایک لمحۂ بے نام اور مِل پائے
بس ایک بات بچی ہے تمہیں بتانے کو

مجھے نہ توڑ کے جاؤ کہ میں وہی پُل ہوں
مِلا تھا جو تمہیں بستی نئی بسانے کو

کھلا ہوں ایسا لطافت کی انتہاؤں میں
سبک ہوا مجھے کافی ہے اب گنوانے کو

میں اس کی آخری خوشبو کے طور زندہ ہوں
جو رہ گیا ہے یہاں ربط اِک نبھانے کو

غزل

– گستاخ بخاری–

حصارِ قدر پسِ اختیار چہ معنی؟ بشر خلیفۂ پروردگار چہ معنی؟
نہیں ہے قسمتِ رزقِ حیات کی تمثیل سبیلِ سلسلۂ روزگار چہ معنی؟
اگر خزاں پہ ہی منتج ہے زیست کا مفہوم تو پھر روانیٔ باغ و بہار چہ معنی؟
خدائے برتر و اعلیٰ و زندۂ جاوید ہماری خاک سے یہ کاروبار چہ معنی؟
جہانِ ارض میں ''سیرو'' کہا گیا ہے تو پھر سمندِ عمرِ رواں شرمسار چہ معنی؟
جو چشمِ شوق کو نظارگی کی ہے توفیق معینِ عین رہیں آبشار چہ معنی؟
شرابِ معرفت اوساں پذیر جب ہو جائے برائے ہوش جوازِ خمار چہ معنی؟
رہے دخیلِ مسافت یہ بُعدِ بے پایاں رہے ہماری لگن برقرار چہ معنی؟
میں کس طرح دلِ گستاخ کو سنبھالوں گا
فضا نہ ہو گی کبھی سازگار چہ معنی؟

ooo

غزلیں

-حسن عباسی-

ایک تجسّس کے اندھیاروں میں پھرتا ہوں
مشعل ہاتھ میں لے کر غاروں میں پھرتا ہوں

صدیوں پہلے کا اک شہر آباد ہے مجھ میں
جس کی گلیوں اور بازاروں میں پھرتا ہوں

مجھ سے پوچھے کوئی رنگ اور مٹی کیا ہے
کیسے کیسے لالہ زاروں میں پھرتا ہوں

ایسے پھرتا ہوں اس جنگل کے پیڑوں میں
جیسے میں بچپن کے یاروں میں پھرتا ہوں

جو خوابوں کے روگ لگا لیتے ہیں خود کو
اپنے جیسے اُن بیماروں میں پھرتا ہوں

میری آنکھیں ایسے غور سے دیکھتی ہے وہ
جیسے شب بھر بادہ خواروں میں پھرتا ہوں

پھر بھی ان سے سیکھ نہیں پاتا ہوں کچھ بھی
سارا دِن میں دُنیاداروں میں پھرتا ہوں

اپنے نام کی لاج حسؔن رکھنی ہوتی ہے
پھول اُٹھا کر میں تلواروں میں پھرتا ہوں

ooo

اپنا سکھ چین گنوائے ہوئے لگتے ہیں مجھے
آپ بھی دِل کے ستائے ہوئے لگتے ہیں مجھے

رات بھر باغ میں یونہی تو نہیں پھرتا میں
دوست بچھڑے ہوئے آئے ہوئے لگتے ہیں مجھے

چاند تاروں کی نگہبانی کیے رکھتا ہوں
اپنے ہاتھوں سے بنائے ہوئے لگتے ہیں مجھے

جب کوئی تیرے علاوہ ہو مخاطب میرا
شعر تازہ بھی سنائے ہوئے لگتے ہیں مجھے

یہ جو آنسو تری پلکوں پہ نظر آتے ہیں
میری آنکھوں سے چُرائے ہوئے لگتے ہیں مجھے

یہ جو چپ چاپ ہی دُنیا سے چلے جاتے ہیں
سب ترے در کے اُٹھائے ہوئے لگتے ہیں مجھے

ooo

غزلیں

-عامر سہیل-

سسکیوں، ہچکیوں ، آہوں کی فراوانی میں ‌ ‌ ‌ اُلجھنیں کتنی ہیں اس عشق کی آسانی میں
یہ ترے بالوں کا تالاب کہ تہہ کو چُھونا ‌ ‌ ‌ حالتِ خواب میں یا عالمِ عریانی میں
بے حجابانہ کسی لہر کا تجھ تک آنا ‌ ‌ ‌ پھر ترے جسم کا بہہ جانا گھنے پانی میں
کہکشاؤں کا ، غزالوں کا ، غزل زادوں کا ‌ ‌ ‌ دُور و نزدیک سے آنا ، تری مہمانی میں
بام و در دیکھتے جاتے تھے کھڑے سکتے میں ‌ ‌ ‌ اک ستارے کا توارد ، تری پیشانی میں
مرمریں اُنگلیاں اِک دِل پہ لکھیں حال حنا ‌ ‌ ‌ پھول آواز کا کھل جائے پشیمانی میں
چاند مخروطی اُبھاروں پہ شعاعیں پھینکے ‌ ‌ ‌ اس قدر محو ، تجھے دیکھ کے حیرانی میں
رات کا جھکنا ، تری پشت پہ دِلداری کو ‌ ‌ ‌ باغ کے پیڑوں کا آ جانا رجز خوانی میں
سایۂ ثابت و سیار کے ہالے میں چلوں ‌ ‌ ‌ اور جہانوں میں رہوں تیری نگہبانی میں

ooo

بڑھی آنکھوں کی عریانی نہ جائے ‌ ‌ ‌ مگر یہ رات طوفانی نہ جائے
گھنیری بارشوں میں درد سینچو ‌ ‌ ‌ کہیں یہ رُت بھی نقصانی نہ جائے
گلابی بادلوں سے جسم ڈھک کر ‌ ‌ ‌ کہیں بھی حسن بارانی نہ جائے
لب و رُخسار سے بھر جائے کمرہ ‌ ‌ ‌ قد و گیسو کی مہمانی نہ جائے
کہیں چلتے ہیں چاقو منہ اندھیرے ‌ ‌ ‌ شبوں کی مرثیہ خوانی نہ جائے
پڑا ہے چاند چھت پر منہ بسورے ‌ ‌ ‌ ہمارے ساتھ سیلانی نہ جائے

نہ ہو بے چہرگی ایسی بھی عامؔر
کہ اپنی شکل پہچانی نہ جائے

غزل

-عدنان بشیر-

قدیم شہروں کی کالی گلیوں میں پہلے سورج کی روشنی تھی
زمیں پہ آنے سے پیشتر ہی کسی سے آدم کی دُشمنی تھی

میں کچھ دُعاؤں کے خستہ تختے پہ گامزن تھا سمندروں میں
سمندروں پہ وہ پہلی بارش تھی اور زمیں ڈوبنے لگی تھی

یہ وہ زمانے تھے جب خدا نے نئے صحیفے اُتارنے تھے
اندھیرے غاروں میں سونے والوں کی آنکھ خوابوں میں جاگتی تھی

مجھے کنویں میں گرانے والے مجھے گلے مِل کے رو رہے تھے
مرے یہاں پر معاف کرنے کی رِیت پرکھوں سے آ رہی تھی

اور ایک دِن وہ عصا کو ٹیکے کھڑے کھڑے لڑکھڑا گیا تھا
ہوا جسے اپنے بازوؤں پہ چہار جانب لیے پھری تھی

مرے مسیحا مری نگاہوں میں آخری خواب جاگتا تھا
یہ کیسا دُکھ ہے کہ تیری آنکھوں میں پہلی تعبیر سو رہی تھی

کئی ستارے تری طلب میں ہزار راتوں سے جاگتے تھے
تو جس گھڑی آسماں سے اُترا وہ رات صدیوں کی روشنی تھی

ہوائیں خانہ بدوش ہو کے سلگتے صحرا میں خیمہ زن تھیں
فرات باغِ عدن کے شاہوں کو نہر کوثر بلا رہی تھی

غزلیں

-سجاد حیدر-

زمیں پہ آسماں کا سوچتے ہیں — کہاں ہیں اور کہاں کا سوچتے ہیں
جہاں ہم ہیں وہاں سے بے خبر ہیں — جہاں ہے تو وہاں کا سوچتے ہیں
کسی کے آستاں پر بیٹھ کر ہم — کسی کے آستاں کا سوچتے ہیں
مجھے اچھی مری خانہ بدوشی — مکاں والے مکاں کا سوچتے ہیں
جنھیں شغلِ زمیں بینی بہت ہو — کہاں وہ آسماں کا سوچتے ہیں
اکیلے کس طرح منزل پہ پہنچیں — جو اپنے کارواں کا سوچتے ہیں
رہِ جذب و جُنوں پہ چلنے والے — کہاں سُود و زیاں کا سوچتے ہیں
جسے نسبت ہے تیرے راستوں سے — ہم ایسی کہکشاں کا سوچتے ہیں
جو تیری یاد کا حصّہ نہیں تھا — اُس اشکِ رایئگاں کا سوچتے ہیں
سو اس میں ہی ہماری منفعت ہے — جو اپنے ہی زیاں کا سوچتے ہیں

ooo

یوں اُس کی یاد کا اِک پُرفُسوں جہان کُھلے — کہ جیسے نیلے فلک پر دھنک کا تھان کُھلے
وہ شخص موجِ محبت میں اس طرح سے کھلا — کہ جیسے لمسِ بہاراں سے زعفران کُھلے
مجھے خبر ہے کہ کس سمت میں سفر ہو گا — اگر کبھی مری کشتی کا بادبان کُھلے
بروئے ہرکس و ناکس ہو آنکھ گویا کیوں — کسی کسی پہ مرے دِل کی ترجمان کُھلے
میں خط پرانے اگر سرسری بھی کھولوں تو — گیا زمانہ مرے دِل کے درمیان کُھلے
کبھی تو آ کے مرے سامنے سے وار کرے — کسی طرح سے تو مجھ پہ وہ مہربان کُھلے
یہ دیکھنا ہے کہ کیا کیا ہیں بھید پوشیدہ — ہوں منتظر کہ کبھی بندِ آسمان کُھلے

غزلیں

-مظہر بخاری-

ظلم کی رات سے لڑا ہوا ہوں / خیمۂ ذات میں پڑا ہوا ہوں
رزم اور بزم سے مَیں واقف ہوں / دُشمنوں میں پلا بڑا ہوا ہوں
لشکری سامنے تو آ میرے / بالمقابل ترے کھڑا ہوا ہوں
تیری بیعت نہیں قبول مجھے / فیصلے پر ابھی اُڑا ہوا ہوں
میرے تن پر کوئی لباس نہیں / اپنے ہی آپ میں گڑا ہوا ہوں
مجھ کو مصلوب کر کے فخر نہ کر / مَیں جہاں تھا وہیں کھڑا ہوا ہوں
یہ بھی مظہرؔ مری شہادت ہے / ذِکر کے باب میں پڑا ہوا ہوں

○○○

رنج و غم سے ، دیدۂ نمناک سے / بھر گیا آنگن خس و خاشاک سے
دُھوپ اُتری ہے فصیلِ جسم پر / منعکس ہوتی ہوئی پوشاک سے
اور کتنی دیر یوں ہے گھومنا / پوچھنا ہے کوزہ گر کے چاک سے
بے سبب کیوں کر ہواؤں میں اُڑوں / رزق وابستہ ہے میرا خاک سے
ایک دِن میں منکشف ہو جاؤں گا / ماورا ہوں منزلِ ادراک سے
مانجھیوں کے ساتھ وہ بھی آئے گا / پوچھ دریا کے کسی پیراک سے!
کشمکش ہے ذہن و دِل کے درمیاں / خون جاری ہے ابھی تک ناک سے
ختم کب میری کہانی ہو گئی / مَیں نمو پرور ہوا پھر خاک سے
کوئی تو ہو گا ہمارے درمیاں / لوٹ آتی ہے صدا افلاک سے
خط میں تو لکھا تھا مظہرؔ آج کا / سوچتا ہوں آئے گا کس ڈاک سے

غزلیں

—ذوالفقار عادلؔ—

پیڑوں سے بات چیت ذرا کر رہے ہیں ہم — نادیدہ دوستوں کا پتہ کر رہے ہیں ہم
دِل سے گزر رہا ہے کوئی ماتمی جلوس — اور اُس کے راستے کو کُھلا کر رہے ہیں ہم
اِک ایسے شہر میں ہیں جہاں کچھ نہیں بچا — لیکن اِک ایسے شہر میں کیا کر رہے ہیں ہم
یہ وقت دِل کے وقت سے پہلے کی بات تھی — اب تو بس اعتبارِ فنا کر رہے ہیں ہم
پلکیں جھپک جھپک کے اُڑاتے ہیں نیند کو — سوئے ہوؤں کا قرض ادا کر رہے ہیں ہم
ہاتھوں کے ارتعاش میں بادِ مراد ہے — چلتی ہیں کشتیاں کہ دُعا کر رہے ہیں ہم
اب تک کوئی بھی تیر ترازو نہیں ہوا — تبدیل اپنے دِل کی جگہ کر رہے ہیں ہم
کب سے کھڑے ہوئے ہیں کسی گھر کے سامنے — کب سے اِک اور گھر کا پتہ کر رہے ہیں ہم
عادلؔ سجے ہوئے ہیں سبھی خواب، خوان پر — اور انتظارِ خلقِ خدا کر رہے ہیں ہم

OOO

کس کو سمجھائیں کہ حضرت، سمجھو! — دِل کو دُنیا کی طرح مت سمجھو
تم مجھے کچھ بھی سمجھ سکتے ہو — کچھ نہیں ہوں تو غنیمت سمجھو
یہ جو دریا کی خموشی ہے، اِسے — ڈوب جانے کی اجازت سمجھو
ایک دِن خاک تو ہو جانا ہے — رائیگانی کو ریاضت سمجھو
میں نہ ہوتے ہوئے ہو سکتا ہوں — تم اگر میری ضرورت سمجھو
رائیگاں ہوتی نہیں خواہشِ دِل — ہو گئی ہے تو محبت سمجھو
یہ جو آنکھوں میں نمی ہے عادلؔ — ڈوبنے والوں کی غفلت سمجھو

غزلیں

– کبیر اطہر –

سامنے رکھ کے ترے تجھ سے چھپایا گیا ہوں
میں تجھے ایک ہی پہلو سے دِکھایا گیا ہوں

اِتنی آساں بھی نہیں دوست جراحت تیری
عام سا زخم سہی دِل پہ لگایا گیا ہوں

یہ جو ترتیب سے عاری ہیں در و بام میرے
میں کسی خوف کی عجلت میں بنایا گیا ہوں

جا رہا ہوں کہیں پیغامِ محبت لے کر
پھول ہوں اور کسی دریا میں بہایا گیا ہوں

تجھ سے یہ کیسا نکل آیا تعلق میرا
میں ترے نام سے محفل میں بلایا گیا ہوں

یہ جو میں جھانکتا رہتا ہوں ہر اک دِل میں کبیر
مجھ پہ کھلتا نہیں کس دِل میں بسایا گیا ہوں

حال مت پوچھ میرے عہد کی تیزی کا کبیر
میں جسے خاک پہ چلنا تھا اُڑایا گیا ہوں

ooo

جیسا لگتا نہیں ویسا بھی تو ہو سکتا ہوں
میں جو تجسیم ہوں بکھرا بھی تو ہو سکتا ہوں

تیری قامت کا اگر نصف ہے قامت میری
میں کسی بوجھ سے دہرا بھی تو ہو سکتا ہوں

یہ جو رونے پر بضد رہتی ہیں آنکھیں میری
میں کوئی اَبر کا ٹکڑا بھی تو ہو سکتا ہوں

خوف لاحق ہے اگر تیز ہوا کا مجھ کو
میں کسی پیڑ میں اٹکا بھی تو ہو سکتا ہوں

تو نے کیا سوچ کے چھو کر نہیں دیکھا مجھ کو
میں تری آنکھ کا دھوکا بھی تو ہو سکتا ہوں

اِک نظر دیکھ تو لے خواب سے باہر آ کر
میں ترے خواب کے جیسا بھی تو ہو سکتا ہے

ooo

غزلیں

-خالد علیم-

ایک میں اور چارسو ہے وقت کا صحرا اکیلا
کون ہو گا اس خرابے میں کوئی مجھ سا اکیلا

آج تک شہرِ وفا کو ، جو گیا ، واپس نہ آیا
دُور تک جاتا نہیں ہے دشت میں رستہ اکیلا

عشق اور وحشت میں اِک کوہِ ندا بھی درمیاں ہے
جس کو سَر کرنا ہے شاید مسئلہ میرا اکیلا

آسماں کی سلطنت میں اِک ستارہ بھی نہیں تھا
جو مرے دِل کی ہتھیلی پر اُتر آتا اکیلا

شب کے رستے پرستاروں کے ہجومِ خوش گماں میں
میری تنہائی کی صورت چاند بھی نکلا اکیلا

اصل کے عکسِ گراں مایہ کا صورت گر ہے لیکن
درد کی دیوار پر ہے پھر بھی آئینہ اکیلا

دِل بھی کیا بہکا ہوا ہے یونہی کرتا پھر رہا ہے
گردشِ امروز میں پیمائش فردا اکیلا

جس کو خود اپنی برائی بھی نظر آئے نہ خالدؔ
کون ناواقف ہے ایسا ، کون ہے ایسا اکیلا

ooo

ہم با ادب ہیں اور رہیں گے ادب کے ساتھ
کیوں زندگی گزاریں کسی بولہب کے ساتھ

آثار پچھلی رات کے ایسے نہ تھے مگر
برسا ہے صبحِ نو کا اُجالا غضب کے ساتھ

میں بھی کشید کرتا ہوں اُمید کی کرن
یونہی تو التفات نہیں مجھ کو شب کے ساتھ

تم بھی ہو ایک آدمی، تم بھی تو خاک ہو
میرا بھی کچھ نسب ہے تمہارے نسب کے ساتھ

دِل تک اُتر گئی ترے ماتھے کی ہر شکن
کچھ اس کو ہے علاقہ ترے چشم ولب کے ساتھ

اپنے ہدف پہ اُن کی زبانوں کا زہر ہے
لائے نہیں وہ تیر کمانوں میں اب کے ساتھ

گم ہیں بس اپنے عکس کی لذت میں آج بھی
یہ آئینہ پسند ، ہمارے ہیں کب کے ساتھ

کھوئے ہیں اپنے اپنے جہاں میں تمام لوگ
اور دیکھیے تو ایک ہی دُنیا ہے سب کے ساتھ

اب ایسے لوگ ڈھونڈھ کے لاؤں کہاں سے میں
کرتے تھے جو جفا بھی تو کرتے تھے ڈھب کے ساتھ

خالدؔ کرو تم اُس کا ادب ، تم پہ جو ابھی
پتھر صدا کے پھینک رہا ہے ادب کے ساتھ

غزلیں

—ندیم پرمار—

کب کسی کے ساتھ کیا ہو، کون جانے — کل ہوا جو ، آج کیا ہو ، کون جانے
ہمسفر ہے ہمسفر سب جانتے ہیں — ہمسفر شاید خدا ہو ، کون جانے
چل دیا جو میرے در پہ دے کے دستک — شام کی پاگل ہوا ہو ، کون جانے
بستی بستی صحرا صحرا گھومتا ہے — خود کو شاید ڈھونڈتا ہو ، کون جانے
لے گیا جو روشنی گھر کی چُرا کر — وہ سحر کا دُھندلکا ہو ، کون جانے
سب سے اِتنا بے تکلف ہو کے ملنا — یہ بھی ان کی اک ادا ہو، کون جانے

ایسا بھی تو ہو ہی سکتا ہے ندیمؔ
ہنستا چہرہ دِل بجھا ہو ، کون جانے

ooo

اے غمِ آرزو سلام تجھے — حاصلِ جستجو سلام تجھے
بے رُخی اُن کی اُف معاذ اللہ — چارۂ گفتگو سلام تجھے
صورتِ دوست بن کے ماہِ تمام — ہو کبھی رُوبرو سلام تجھے
بعد از دید عالمِ حیرت — نعرہ اللہ ہو ، سلام تجھے

الوداع اے آوارگیِ ندیمؔ
گھوم تو کُوبکو سلام تجھے

ooo

غزل

-آصف رضاؔ-

ساحلِ انتظار میں تنہا — یاد وہ لہر لہر آئے مجھے
دشتِ دیوانگی کے ٹیلوں پر — رقص کرتی ہوا بلائے مجھے
آسماں سے گرے کوئی شعلہ — چوب اِک خشک ہوں جلائے مجھے
اجنبی مجھ سے آ گلے مِل لے — آج اِک دوست یاد آئے مجھے
بھول بیٹھا ہوں میں زمانے کو — اب زمانہ بھی بھول جائے مجھے
اک گھروندہ ہوں ریت کا پیہم — کوئی ڈھائے مجھے ، بنائے مجھے
ایک حرفِ غلط ہوں ہستی کا — نیستی کیوں نہ پھر مٹائے مجھے
کب ہے دعویٰ مجھے بلندی کا — کیوں نظر سے کوئی گرائے مجھے
دفعتاً میرے رُوبرو آ کر — آئینے میں کوئی ڈرائے مجھے
آندھیاں کیوں مری تلاش میں ہوں — ایک جھونکا ہی جب بجھائے مجھے
جیسے اک نقشِ نا درست کو طفل — کوئی اندر سے یوں مٹائے مجھے

راکھ اپنی اُمنگ کی ہوں ، رضاؔ!
آ کے جھونکا کوئی اُڑائے مجھے

○○○

غزلیں

—طاہرہ صفی—

بہاروں کو خزاں ہونے میں کتنی دیر لگتی ہے
یقیں کو بھی گماں ہونے میں کتنی دیر لگتی ہے

اگر اُس کی عنایت ہو، جو ہو اُس کا کرم شامل
تو ذرّے کو جہاں ہونے میں کتنی دیر لگتی ہے

ہوائیں رُخ بدل لیں تو بچیں گے آشیانے بھی
کہ منظر کو دُھواں ہونے میں کتنی دیر لگتی ہے

جہاں نیّت بدل جائے گواہی بھی بدل جائے
زباں سے بے زباں ہونے میں کتنی دیر لگتی ہے

جنھوں نے لعل کھوئے ہیں وہی مائیں بتائیں گی
کہ بچوں کو جواں ہونے میں کتنی دیر لگتی ہے

OOO

گزر گئی شبِ ہجراں اگر تو کیا ہو گا
جو کُھل گیا یہ فریبِ نظر تو کیا ہو گا

درِ قفس تو کُھلا ہے مگر یہ ڈر ہے مجھے
بکھر گئے کہیں سب بال و پر تو کیا ہو گا

وہ قتل کرتا ہے اور یہ تو سوچتا ہی نہیں
نکل کے آ گئے سب نوحہ گر تو کیا ہو گا

صنم تراشا ہے میں نے اندھیری آنکھوں سے
پلٹ کے آ گئی میری نظر تو کیا ہو گا

حصار کھینچ رہا ہے وہ اپنے چاروں طرف
اگر وہ گِھر گیا اپنے ہی گھر تو کیا ہو گا

یہی تو سوچ کے رختِ سفر ہی کھول دیا
ہوا نہ گر وہ مرا ہم سفر تو کیا ہو گا

وہ عکس دیکھ کے آئینہ توڑ دیتا ہے
نظر میں رُک گئی تصویر گر تو کیا ہو گا

OOO

غزل

-اشرف سلیم-

پھر کوئی ہم کو بغاوت کی ہوا دیتا ہے
جو بھی دیوار اُٹھاتا ہوں گرا دیتا ہے

ہم کو منظور نہیں تیری رفاقت کا سفر
اب یہاں کون محبت کا صلہ دیتا ہے

احتجاجاً بھی اُٹھائیں گے نہ ہم ہاتھ اپنے
دیکھنا یہ ہے کہ وہ فیصلہ کیا دیتا ہے

اب توقع ہی نہیں کوئی رہائی کی ہمیں
جو بھی آتا ہے سزا اور بڑھا دیتا ہے

جشن اب ٹوٹتے خوابوں کا منائیں گے سلیمؔ
اور دیکھیں گے ہمیں کون صلہ دیتا ہے

غزل

-شفیق مُراد-

مسئلے جو بھی تھے وہ حل ہو گئے
تو مِلا تو ہم مکمل ہو گئے

پاؤں رکھتے ہی گلستاں میں ترے
سبز موسم پھر مسلسل ہو گئے

جتنے بھی کل تھے ہوئے وہ آج اور
آج جتنے بھی تھے وہ کل ہو گئے

بندگی کی ہو گئی تکمیل پھر
درد و غم جب رُوح میں حل ہو گئے

آج چھائی تھی ذرا سنجیدگی
اُس کو دیکھا اور چنچل ہو گئے

میرے آنسو پر ترا آنسو گرا
اشک پھر اشکِ مسلسل ہو گئے

مسکرا کے اُس نے جب دیکھا مرادؔ
خشک دریا دِل کے جل تھل ہو گئے

غزل

-فیض صحرائی-

جن پرندوں کے گھر نہیں ہوتے
کس طرح دربدر نہیں ہوتے

رات بھر ایک خوف ہوتا ہے
آپ جب رات بھر نہیں ہوتے

تو ہی محروم آنکھ ہے ورنہ
حُسن والے کدھر نہیں ہوتے

ہاں وہی پر لگا کے اُڑتی ہے
بات وہ جس کے پر نہیں ہوتے

کون کہتا ہے عشق والوں کے
راستے پُر خطر نہیں ہوتے

جو نہ اچھا خیال دیں ہم کو
لفظ وہ معتبر نہیں ہوتے

مستقل درد جن کا ورثہ ہے
درد سے بے خبر نہیں ہوتے

خودبخود ٹہنیاں جھکیں جن کی
پیڑ وہ بے ثمر نہیں ہوتے

فیض اِن بے ضمیر لوگوں کے
جسم ہوتے ہیں سر نہیں ہوتے

ooo

غزلیں

انوار قادری

صورتِ گل بکھر گئے ہوتے — غم نہ ہوتے تو مر گئے ہوتے
تذکرہ دوستوں کا گر کرتے — کتنے چہرے اُتر گئے ہوتے
دم غنیمت ہے مہربانوں کا — ورنہ سب زخم بھر گئے ہوتے
آشیانہ تو ایک بن جاتا — کیا تھا گر بال و پر گئے ہوتے
وائے قسمت جو رہ رہے ہیں یہاں — گھر جو ہوتا تو گھر گئے ہوتے
ہم مقابل اگر نہ ہو جاتے — جانے کتنوں کے سَر گئے ہوتے
آج جس طور جی رہے ہیں ہم — اس سے بہتر تھا مر گئے ہوتے

کیسے بگڑے سنور چکے آخر
کاش ہم بھی سنور گئے ہوتے

ooo

ہر کام حُسن و خوبی سے کر جانا چاہیے — جینا اگر نہ آئے تو مر جانا چاہیے
یا گل کی طرح ہو رہیں تزئینِ گلستاں — خوشبو کی طرح ورنہ بکھر جانا چاہیے
اس دور میں نہ کیجیے خود پہ بھی اعتبار — سایہ بھی اپنا دیکھ کے ڈر جانا چاہیے
حد ہو چکی ہے اپنے بگڑنے کی دوستو — بہتر ہے اب یہی کہ سنور جانا چاہیے
خواہش ہے موتیوں کی تو ساحل کو چھوڑ کر — گہرے سمندروں میں اُتر جانا چاہیے

یوں کب تلک مکان بدلتے رہیں گے ہم
اب سوچتے ہیں لوٹ کے گھر جانا چاہیے

ooo

غزل

-فیصل ہاشمی-

گو کہ موجود و میسر سے گریزاں تھا میں
بے نمو عہد میں آئندہ کا اِمکاں تھا میں

شامِ افسوس مرے دِل نے مرا ساتھ دیا
شہرِ ہم خواب میں اِک رات کا مہماں تھا میں

سانس لینے سے مرا جسم لرز جاتا تھا
بند گلیوں کی طرح شام سے ویراں تھا میں

ایک جیسے در و دیوار تھے چاروں جانب
اِتنے ہم شکل مکانوں میں پریشاں تھا میں

اپنے خوابوں کی طرح اپنی کتابوں کی طرح
اپنے دم توڑتے لفظوں سے پشیماں تھا میں

یک بیک آگ نے پوشاک پکڑ لی میری
اِتنا نزدیک اُسے دیکھ کے حیراں تھا میں

غزل

-جاوید قاسم-

کیسے کہہ دوں کہ بدلتے ہوئے لمحے تم ہو
بے وفا وقت بھی اِتنا نہیں جتنے تم ہو

تم کو جانا ہے کہاں کس کی طلب ہے تم کو
میرے ہمراہ بڑی دیر سے رستے تم ہو

پھیل جاتی ہے کوئی کاہکشاں دامن پر
اشک بن کر میری پلکوں پر اُترتے تم ہو

میں تو اِک عمر سے پیاسا ہوں مرے ابرِ کرم
اور کہتا ہے زمانہ کہ برستے تم ہو

آؤ اِس بار کسی شخص کو ضامن کر لیں
میرے نزدیک تو ہر بار بدلتے تم ہو

بامِ اُمید پہ ہر روز سنور کر قاسم
دِل کے آنگن میں سدا خاک اُڑاتے تم ہو

غزلیں

—ناصر بشیر—

ستم گروں کے نگر میں ستم کیا جائے　　کوئی مرے کہ جیے کچھ نہ غم کیا جائے
ذرا ذرا سے مسائل سے بن گیا ہے پہاڑ　　اب اس پہاڑ کی مٹی کو کم کیا جائے
کوئی صدا ہے نہ تازہ ہوا نہ دھوپ یہاں　　ہمارے گھر کو بھی زنداں میں ضم کیا جائے
شمال والوں کی سورج سے یہ گزارش ہے　　کبھی کبھی تو اِدھر بھی کرم کیا جائے
زمین کھسکی ہوئی ہے ہمارے قدموں سے　　پھر اس زمین کو زیرِ قدم کیا جائے
ہمارے عہد پہ جن کا وجود بھاری ہے　　وہ کہہ رہے ہیں کہ ذِکرِ عدم کیا جائے

دیا ہے اَبر اور دریا نے مشورہ ناصؔر
اب آنسوؤں ہی سے مٹی کو نم کیا جائے

ooo

تمھارے خنجر و شمشیر کام آئے ہیں　　ہم آئے ہیں تو برونِ نیام آئے ہیں
بہت حسین ہے اسلوبِ طعنہ و دُشنام　　کہاں سے شہر میں یہ خوش کلام آئے ہیں
سفر میں دیکھا نہیں ایک بھی نیا منظر　　رُکے تو دیکھنے والے مقام آئے ہیں
پرندے آج کوئی معجزہ دِکھائیں گے　　باہتمام اگر زیرِ دام آئے ہیں
ہم اپنے ہاتھوں سے کاٹیں گے گردنیں اپنی　　ہم آج لے کے نیا انتظام آئے ہیں

یہ آٹھ کالمی اخبار کھا گیا ہم کو
ہم ایسے لوگ بھی شہرت کے کام آئے ہیں

ooo

غزلیں

–کامی شاہ–

نئی کہانی سنا رہا ہوں
میں در سے دستک اُٹھا رہا ہوں
چراغ کوئی نہیں میسر
سو کام دِل سے چلا رہا ہوں
اُسے محبت نہیں ہوئی تھی
یہ بات خود کو بتا رہا ہوں
وہ آنے والا نہیں ہے واپس
جسے میں واپس بلا رہا ہوں
بھلانے والا نہیں یوں اس کو
اسے بتاؤ میں آ رہا ہوں

ooo

اِک نئے مسئلے سے نکلے ہیں
یہ جو کچھ راستے سے نکلے ہیں
کاغذی ہیں یہ جتنے پیراہن
ایک ہی سلسلے سے نکلے ہیں
لے اُڑا ہے ترا خیال ہمیں
اور ہم قافلے سے نکلے ہیں
ہم جو نکلے ہیں بھیس بدلے ہوئے
تو کسی آئینے سے نکلے ہیں
یاد رہتے ہیں اب ہمیں جو کام
یہ اسے بھولنے سے نکلے ہیں

ooo

غزل

-سعدیہ قریشی-

بنامِ شہرِ تمنا یہ خواب کافی ہے
تمھارے نام کا تنہا گلاب کافی ہے

وہی جو ماں نے دُعاؤں کی بدلیاں مانگیں
اُنھی دُعاؤں کا ہم کو سحاب کافی ہے

محبتوں کے سفر میں ہم ایسے لوگوں کو
بس ایک لمحۂ خوش باریاب کافی ہے

تمھارے خواب میں اِک عمر رائیگاں گزری
ہمارے واسطے یہ اضطراب کافی ہے

غریبِ شہر کی سانسیں ابھی نہیں ٹوٹیں
امیرِ شہر کو اِتنا عذاب کافی ہے

بلند اور ہوئی ہے مرے چراغ کی لو
ہوائے تند کو اتنا جواب کافی ہے

غزلیں

–غضنفر عباس سیّد–

سانسوں پہ رقم ہو مرے اعصاب میں اُترے
منظر کوئی اِس دیدہ بے خواب میں اُترے

یا بابِ ستم بند ہو دُنیا سے خدایا!
یا مہدیؑ کوئی منبر و محراب میں اُترے

نغموں سے تو آیا نہیں ذہنوں میں طلاطم
محشر ہی کوئی جنبشِ مضراب میں اُترے

تازہ نہ کرے ظلم کی ایجاد خدا کہ!
انسان اگر ملکِ مہ تاب میں اُترے

کرتے ہیں سبھی سیر سرِ ساحل مژگاں
آئے کوئی طغیانی و سیلاب میں اُترے

صد حیف کہ جب لوگ تھے پوشاک سے محروم
زرتار ستارے ترے کم خواب میں اُترے

آئے نہیں پھر سطح زمانہ پہ غضنفرؔ
کچھ ایسے ہم اِس ہجر کے گرداب میں اُترے

OOO

جہاں تک یہ جہاں پھیلا ہوا ہے
سرابِ جسم و جاں پھیلا ہوا ہے

زمیں گویا ہے کوئی دستِ حیراں
جو زیرِ آسماں پھیلا ہوا ہے

نہیں سیراب گر ہونٹوں کی سطحیں
سمندر رائیگاں پھیلا ہوا ہے

کھلیں کیا پھول کہ دُنیا میں ہر سُو
عداوت کا دھواں پھیلا ہوا ہے

کہاں باقی شفق آثار شامیں
یہ منظر خوں چکاں پھیلا ہوا ہے

ہیں مخفی جسم و جاں میں کائناتیں
مکاں میں لامکاں پھیلا ہوا ہے

نہ جانے کون گزرا ہے نظر سے
غبارِ کارواں پھیلا ہوا ہے

نہیں ملتا کوئی گوشہ سکوں کا
بظاہر خاکداں پھیلا ہوا ہے

غضنفرؔ کچھ تو ہے کہ چار جانب
یہ شورِ الاماں پھیلا ہوا ہے

غزلیں

-رفیق سیٹھی-

اس کو پکارتی ہے بوند ایک اِک لہو کی
اے کاش مِل وہ جائے جس کی ہے آرزو کی

تیرے سوا خدا سے ہم نے نہ کچھ بھی مانگا
بس تیری آرزو کی بس تیری جستجو کی

سانسوں سے تیری اُبھری میری وفا کی خوشبو
گالوں پہ تیرے آئی لالی مرے لہو کی

ہم نے جو سازِ دِل پہ نغمہ وفا کا چھیڑا
رسوائی اپنی ہم نے ایسے چہار سو کی

تیرے فراق میں تو اپنی ہوئی یہ حالت
گرتی ہیں آبشاریں آنکھوں میں اب لہو کی

کوشش ہے بھول جاؤں دِل سے کسی کی یادیں
اس واسطے ہے سنگت یہ شیشہ و سبو کی

وہ چودھویں کی راتیں وہ پیار کے زمانے
ہیں اب بھی یاد مجھ کو گھڑیاں وہ گفتگو کی

رسوائیوں کی دلدل میں مجھ کو پھینک آئے
اپنوں نے ساتھ میرے کی ہے یہ بدسلوکی

ooo

نگارخانۂ دُنیا میں اکیلا بن کے
تم کو میں یاد کیا کرتا ہوں تنہا بن کے

کون سی راہ تھی ایسی جہاں ڈھونڈا نہ تمہیں
اب تو رستہ بھی ٹھہر جاتا ہے صحرا بن کے

ڈھونڈتا ہوں میں تصور کے سرابوں میں تمہیں
میں نے پانی نہیں ڈھونڈا کبھی تشنہ بن کے

موسم گل بھی خزاں بن کے گزر جاتا ہے
کیا ملا دِل کو مرے باغِ تمنا بن کے

جلتیَ ہے بزمِ حریفاں تو اسے جلنے دو
جان تو شمع پہ میں دوں گا پتنگا بن کے

جب بھی گونجی کسی بھنورے کی صدا گلشن میں
پھول شرما گئے اصرارِ تمنا بن کے

میری ویران سی بانہوں میں سما کر دیکھو
یہ ملن ٹھہرے گا دونوں کا سہارا بن کے

زندگی بیت چکی پھر بھی نہ گھبرا اے رفیقؔ
سب گزرتے ہیں کسی روز جنازہ بن کے

غزل

–محمد افضل عباسی–

کوئی چراغ اپنا بجھانے نہیں دیا
میں نے ہوا کو ہاتھ لگانے نہیں دیا

وعدہ کیا تو میں نے نبھایا تمام عمر
اُس کو کوئی بھی آنسو بہانے نہیں دیا

اس طرح اُن کو دیکھنے میں لطف اور تھا
سوئے ہوؤں کو دِل نے جگانے نہیں دیا

دُکھ ہو گا اُن کی خامشی کو دیکھ کر مجھے
لب پر جو حرفِ شوق بھی لانے نہیں دیا

دیکھا کچھ اس نظر سے کہ پتھر سا کر دیا
اس نے قدم بھی مجھ کو اُٹھانے نہیں دیا

افضلؔ وہ اپنے گھر میں بلائے گا کس طرح
اُس نے مجھے تو خواب میں آنے نہیں دیا

غزل

–واصف سجاد–

دامنِ دِل کھینچ سکتی ہی نہیں کوئی طلب
ہم نے اے دُنیا رکھی ہے واجبی تیری طلب

کچھ سمجھ آتا نہیں دونوں ہیں کیسے ساتھ ساتھ
جسم کے اپنے تقاضے رُوح کی اپنی طلب

ہو گئی معدوم فرصت ، رابطے کمزور تر
جاگ اُٹھی ہے نجانے شہر میں کیسی طلب

کیا اسے خوش حال کر پائیں گے فرسودہ خیال
شاعری کو ہے سدا مضمونِ تازہ کی طلب

کیا مجھے بھولا نہیں تو اتنی مدت بعد بھی
کیا ترے دِل میں ابھی موجود ہے میری طلب

غزل

–راحتؔ سرحدی–

یوں نہ حالات کے نیزے پہ مرا سر ہوتا
تجھ سے ہوتی نہ ملاقات تو بہتر ہوتا

مختصر یہ کہ مجھے اُس نے نہیں ملنا تھا
دشت درپیش نہ ہوتا تو سمندر ہوتا

بات تو جب تھی کہ انجامِ محبت اپنا
عام فرسودہ روایات سے ہٹ کر ہوتا

رات چلتی ترے کاجل سے اجازت لے کر
سامنے صبح ترے چہرے کا منظر ہوتا

اُس کا آنچل تو کوئی دور نہیں تھا راحتؔ
تیرے ہاتھوں میں اگر تیرا مقدر ہوتا

OOO

غزلیں

–رخشندہ نوید–

کہانیاں نہ ختم ہوں گی اختتامیوں کے ساتھ
مجھے قبول کر مری تمام خامیوں کے ساتھ
یہ کیا ہوا کہ اس کے باوجود بازی ہار دی
کھڑی تھی میں تو سر اُٹھائے اپنے حامیوں کے ساتھ
بسر کریں اسی طرح ، حیات تو حیات ہے
دِل و جگر کی اس خلش کو، ناتمامیوں کے ساتھ
تو اپنے حسن و ناز کے غرور میں ہی جل بجھی
وہ لُوٹ لے گا بزم اپنی خوش کلامیوں کے ساتھ
جھکائے سر چلے تو جائیں گے خدا کے رُوبرو
نہ جانے کیا ہو روزِ حشر نیک نامیوں کے ساتھ
مری جڑیں اُکھاڑنے کی فکر اس کو ہے مگر
ہوا چلے تری طرف سبک خرامیوں کے ساتھ

○○○

بات جو بھی دِل میں ہے اظہار میں تو آئے گی
درد کی گہری چبھن گفتار میں تو آئے گی
تو کہیں چھپ جائے، میری آنکھ سے، تیری شبیہہ
جب بہار آئی تو برگ و بار میں تو آئے گی
بعد مدت کے اسے دیکھیں گے، ٹوٹے گا سکوت
دِل کی ٹھہری ناؤ پھر رفتار میں تو آئے گی
ہار کر خود کو میں چپ ہو جاؤں گی تیرے حضور
جیت کر اِک سرخوشی سرکار میں تو آئے گی
اور کیا تو چاہتی ہے چار شعروں کے عوض
تیرے مرنے کی خبر اخبار میں تو آئے گی
تیز بارش میں بہت بھیگی ہے میرے دِل کی چھت
کچھ نمی آخر در و دیوار میں تو آئے گی

○○○

غزلیں

—رامش منہاس—

خوف غیروں کا نہ اپنے دُشمنوں کا چاہیے
زخم کھانے ہوں تو حلقہ دوستوں کا چاہیے

شوق سے اپنے گھروں میں پر سجا رکھو مگر
دِل میں کچھ تو درد زخمی پنچھیوں کا چاہیے

جل رہی ہیں آگ میں سارے دِلوں کی بستیاں
مستقل موسم یہاں پر بارشوں کا چاہیے

دوستو تیرہ شبی کو زیر کرنے کے لیے
شہر میں لشکر کوئی تو جگنوؤں کا چاہیے

میں اُسے کیسے نکالوں یاد کے زندان سے
مے کشوں کو ہر گھڑی غم مے کدوں کا چاہیے

جو ہمیں اندر کی تصویریں بھی دِکھلا دے کبھی
رنگ رامشؔ اس طرح سے آئینوں کا چاہیے

ooo

وہ بے ہنر سے بھی کیسے ہنر نکالتا ہے
میں ایک بیج ہوں مجھ سے شجر نکالتا ہے

وہی نکالتا ہے پتھروں سے رعنائی
جو مشتِ خاک سے لعل و گہر نکالتا ہے

بھنور لپیٹتا ہوں میں تو اپنے قدموں میں
وہ پانیوں سے کوئی رہگزر نکالتا ہے

وہی تو کاٹتا ہے پر مِری دُعاؤں کے
وہی دُعاؤں کے خود بال و پَر نکالتا ہے

لپیٹ دیتا ہے دِن کو سیاہ راتوں میں
شبِ سیاہ سے پھر وہ سحر نکالتا ہے

کبھی جو گردشِ دوراں اُداس کرتی ہے
تو مشکلوں سے وہی چارہ گر نکالتا ہے

ooo

غزلیں

-محمود عامر-

روز کرتے ہیں اِن آنکھوں کے کنارے بارش
تو بھی آ دیکھ کبھی ساتھ ہمارے بارش

کاش تم جان سکو درد کے موسم کا عذاب
کاش برسے کبھی آنکھوں سے تمھارے بارش

کچے گھر کی طرح انسان گرا دیتی ہے
بعض اوقات کرے کتنے خسارے بارش

تذکرہ روز کیا کرتی ہیں جل تھل آنکھیں
پوچھتی رہتی ہیں ہم کو ترے بارے بارش

توڑ دیتی ہے دِل و جاں کی طنابیں جاناں
رُوپ طوفان کا جب بھی کبھی دھارے بارش

کیسے مر مر کے جیا کرتے ہیں افسردہ لوگ
کیسے کیسے ہمیں صدموں سے گزارے بارش

اشک دھو دیتے ہیں یوں چاند سا چہرہ جیسے
گرد آلود گلابوں کو نکھارے بارش

ہجرتوں نے بھی ہمیں سکھ نہیں بخشا عامؔر
ہم جہاں پہنچے گئی ساتھ ہمارے بارش

ooo

عجیب آنکھوں نے رُوپ دھارے جو تم نہیں ہو
سجے ہیں پلکوں پہ میری تارے جو تم نہیں ہو

اُداس موسم کی جان لیوا فضا میں جاناں
یہ دِل ہر اِک پل تمھیں پکارے جو تم نہیں ہو

وہ ہاتھ جن کو میں اپنے ہونٹوں سے چومتا تھا
وہ ہاتھ بھی چھن گئے تمھارے جو تم نہیں ہو

وہ ناؤ جس کو سپرد طوفان کر گئے تم!
وہ ناؤ کیسے لگے کنارے جو تم نہیں ہو

چلے تھے جن پر اکٹھے مِل کر، تمام رستے
کریدتے ہیں تمھارے بارے جو تم نہیں ہو

علاجِ غم کو گئے تھے ہم میکدے میں لیکن
نہ جام بھی دے سکے سہارے جو تم نہیں ہو

بہت ہی سمجھا رہے ہیں عامؔر اُداس دِل کو
مگر یہ بس میں نہیں ہمارے جو تم نہیں ہو

غزلیں

—عامر عبداللہ—

تنہائی کے فرغل میں جو لپٹی رہتی تھی
رنج بھری وہ دُنیا اِک دِن دِل میں اُتری تھی

غم کا جشن منانے والے روگی لوگوں کے
سینوں میں سو چھید ہوئے تھے رگ رگ زخمی تھی

خالی پن ہی اندر باہر دونوں جانب تھا
ہر سُو تھا اک ہُو کا عالم بس بے خبری تھی

ہر جانب اُلجھاوے تھے بہکاوے تھے ہر سُو
جادونگری کی ہر شے ہی چھل کی عادی تھی

اُس کے بھید کو پانے نکلے ہم دیوانے لوگ
بینائی کو روند گئی ایسی حیرانی تھی

شب تو بیت گئی تھی پھر بھی اندھیارا سا تھا
صبح کے آنے میں عامرؔ تاخیر یہ کیسی تھی

ooo

بڑی ہی ویران رہ گزر ہے گزر چکے ہیں گزرنے والے
نہ اب یہاں برگِ خشک کوئی نہ اب شجر سایا کرنے والے

وہ ماہ رو وہ حسین قامت تمھاری جانب بڑھے تھے اک دِن
سمندرو کچھ بتاؤ گے کیا گئے کدھر کو اُترنے والے

ہوا کی زد پر ہے جو بھی آیا کبھی بچا ہے کہ ہم بچیں گے
وداع دو پیشوا پرندو کہ ہم ہیں پل میں بکھرنے والے

تو اپنے حصے کے اَشک سارے بہا چکی چشم خشک تو کیا
غموں کی ذرّہ نوازیوں سے لہو سے دامن ہیں بھرنے والے

ہزار غم تیرے ہجر میں ہیں مگر یہی ہجر زندگی ہے
اگر یہی ہجر زندگی ہے تو ہم ہیں جاں سے گزرنے والے

غزل

—خالد خواجہ—

ہر شخص لالچی ہے ، وفا نا شناس ہے
لگتا ہے سارا شہر مرا بے لباس ہے

اُس کو جدا ہوئے بھی تو اِک عمر ہو گئی
اِک عمر سے وہ شخص مرے آس پاس ہے

یہ سلسلہ مصائب ہستی کا ، دوستو!
میری کتابِ زیست کا اِک اقتباس ہے

جب بھی ستم کرے گا ، مجھی پر کرے گا وہ
سچ پوچھئے تو اُس سے یہی ربطِ خاص ہے

مَیں بھی اُداس ہوں، یہ کسی دوست کے بغیر
خالدؔ جی میرے شہر کا موسم اُداس ہے

غزل

—مجید سالکؔ—

کیسے جانیں ، لوگ سیانے ، سودائی کا دُکھ
سب سے بڑھ کر لاحق اس کو تنہائی کا دُکھ

اِس دُنیا کو کھیل تماشہ یونہی نہیں بنایا
اُس کو بھی تھا لاحق لوگو یکتائی کا دُکھ

خالی پیٹ سے نکلی چیخیں سب کے من کو بھائیں
کاش کبھی تو جان سکیں وہ شہنائی کا دُکھ

دور نئے نے انساں کو مصروف کیا ہے اِتنا
سب کے ساتھ لگا ہے قحط شناسائی کا دُکھ

شہر میں جب سے جنگل کا قانون ہوا ہے نافذ
مجھ کو اچھا لگتا ہے اب تنہائی کا دُکھ

چاندی بال کیے بیٹھی ہے در پر رُوٹھی بیٹی
بوڑھی امّاں کس سے بانٹے رسوائی کا دُکھ

سالکؔ نام دیا پھر اُس کو رکھا دید کا پیاسا
کب تک وہ سہہ پائے گا بے پروائی کا دُکھ

غزل

—احمد جلیل—

نہیں آساں ہمارے درد کی تفہیم کر لینا
بہت مشکل ہے محسوسات کی تجسیم کر لینا

تمہارا کیا کہ تم تو مصلحت بیں ہو ہمیشہ سے
ہوئے حالات جیسے اس طرح ترمیم کر لینا

بڑی ترتیب سے لشکر عدو کے بڑھتے آتے ہیں
مرے لوگو ! خدارا اپنی کچھ تنظیم کر لینا

جو رائے معتبر آئے نظر وہ مان بھی لینا
سدا اپنی نہ منوانا کبھی تسلیم کر لینا

ہوس معیار جب ٹھہرے، نہ یہ تلوار جب ٹھہرے
تو پھر اجداد کی اقدار کی تعلیم کر لینا

ہمارے بعد جب گھر کے اثاثے بانٹنے بیٹھو
ہمارے درد کی دولت کو بھی تقسیم کر لینا

کبھی ہم جاگتی راتوں میں تم کو یاد آ جائیں
تو دو آنسو بہا کر ہجر کی تعظیم کر لینا

غزل

—غلام شبیر اسد—

کہاں پر رہ گئے ہیں وہ نہ جانے
پلٹتے ہی نہیں گزرے زمانے

عجب کردار کی ہے یہ کہانی
بنائے کوزہ گر ، کُوزے پرانے

ہوائے کج ادا کے مست جھونکے
لگے ہیں خشک پتوں کو اُڑانے

مری خانہ بدوشی سے پرندے
پَروں پر بُن رہے ہیں آشیانے

مرے چہرے کی گہری سلوٹوں میں
فسانے ، رتجگے ، تیرے زمانے

شمارِ وقت سے باہر اسؔد تھا
اِسے گنوا دیا تیری ادا نے

غزل

-غزالی-

خبر ملی ہے مجھے شہر کی ہواؤں سے
وہ شخص میری طرف آ رہا ہے گاؤں سے

زمیں پہ ثبت کیے جائیں دستخط اپنے
کہ ہم کو لوٹ کے آنا بھی ہے خلاؤں سے

عبارتوں سے معانی جدا ہیں کچھ ایسے
کہ جیسے بچھڑے ہوئے لعل اپنی ماؤں سے

ہماری کھیتیاں برسات نے جلا ڈالیں
کہ اب کے آگ برستی رہی گھٹاؤں سے

محاذ سے نہ ہٹے میرے ولولوں کے چراغ
شہید ہو گئے لڑتے ہوئے ہواؤں سے

حروف جب سے غزالؔی اثر سے خالی ہیں
قبولیت بھی پرے ہو گئی دُعاؤں سے

غزل

-عرفان صادق-

فراق لمحوں کے حاشیوں کو سنوارتا ہے
تمام شب وہ مرے بدن میں گزارتا ہے

مرے لیے تو اندھیرے دامن میں بھر کے لایا
وہ جس کو سورج تمام عالم پکارتا ہے

میں کیسے اپنے کٹے پروں میں سمٹتا جاؤں
فلک کے زینے سے کوئی مجھ کو پکارتا ہے

اُتر کے آنکھوں کی چلمنوں سے وہ ریزہ ریزہ
فشارِ جاں کا ہر ایک منظر نکھارتا ہے

گزرنے والے اُداس دِن کا ہر ایک لمحہ
مرے زمانے کا کرب مجھ میں اُتارتا ہے

ترا گماں بھی ہے ندرتوں کا حسین سنگم
غزل کے پیکر میں رنگ کتنے اُبھارتا ہے

غزل

—احمد سہیل—

شہر کو چھوڑ دو ، اور گاؤں کو جاؤ تم بھی
اس تعلق کے تکلف کو اُٹھاؤ تم بھی

آگ جنگل میں بھڑک جائے گی کل شام تلک
آج بادل کو اداؤں سے لبھاؤ تم بھی

دوسرے چہرے مجھے کم ہیں رفاقت کے لیے
میری خاطر تو کوئی چہرہ سجاؤ تم بھی

میں کہیں سبزۂ خود رو کی طرح اُگ آؤں
اور وہیں پھول کی صورت نکل آؤ تم بھی

میرے ہاتھوں میں ترے نام کی کوئی ریکھا
تیرے ہاتھوں میں نہ آئی ہو ، دِکھاؤ تم بھی

چاند کو روک دیا مَیں نے ہواؤں میں ، سہیلؔ!
تم مجھے روک لو ، جادو یہ دکھاؤ تم بھی

غزل

—خالد نقاش—

ڈھل گیا ماہِ تاب شیشے میں
ہم ہوئے باریاب شیشے میں

بادِ شب کے تھے ریشمی جھونکے
گزرے ہیں کتنے خواب شیشے میں

دلِ متروک کا مداوا کریں
کچھ تو ہے دستیاب شیشے میں

بس ہے ویرانیِ حیات یہاں
بھر کے لاؤ شباب شیشے میں

دِل ہے سیماب خیز کچھ ایسے
جیسے ہو اضطراب شیشے میں

بزمِ ہمدم کہاں رہی نقاشؔ
زیست تھی کامیاب شیشے میں

غزل

—ضیاء پرویز—

یاد وہ نام مِرے دستِ دُعا نے رکھا
غم کی دُنیا میں مجھے جس کی وفا نے رکھا

یوں چلے آئے ہیں وہ دِل کے نہاں خانے میں
جیسے گلشن میں قدم بادِ صبا نے رکھا

اور بڑھنے نہ دیا دِل کے جنوں کو اُس نے
مرے ایماں کا بھرم اُس کی حیا نے رکھا

تری صورت کو نگاہوں میں بسایا ہے کبھی
تری یادوں کو کبھی دِل کے سرہانے رکھا

شہر کے لوگ تو دُشمن تھے ہمیشہ میرے
مری عزت کا بھرم میرے خدا نے رکھا

تجھ سے مِل کر بھی مرے دِل کی اُداسی نہ گئی
شبِ تاریک میں سورج کی ضیاؔء نے رکھا

غزل

—عارف حسین عارف—

کارِ بے کار سے نکلتے ہی
مر گئے پیار سے نکلتے ہی

ایک جنگل کا سامنا تھا مجھے
تنگیٔ غار سے نکلتے ہی

پھر ترے پاس لوٹ آیا ہوں
تیرے انکار سے نکلتے ہی

اِک کہانی نئی نکل آئی
ایک کردار سے نکلتے ہی

ایک شہکار بول اُٹھا ہے
دستِ فنکار سے نکلتے ہی

پھر سے اپنی انا میں کھو گئے ہیں
تیرے اِصرار سے نکلتے ہی

مجھ سے آ کر لپٹ گیا عارفؔ
سایا دیوار سے نکلتے ہی

غزل

—وصی الحسن نقاشؔ—

ڈھونڈنے نکلا ہوں خود کو دھوپ کے بازار میں
میرا سایہ گم ہوا تھا سایۂ دیوار میں

میری ناکامی ہے میری کامیابی کی دلیل
مجھ کو لکھا ہی گیا تھا عرصۂ بے کار میں

جانے کیسے دائرے میں زندگی بھر میں رہا
کوئی مرکز ہی نہیں نکلا مری پرکار میں

زندگی کا کھیل شاید اس لیے چلتا رہا
میں کہانی کی طرح بیٹھا رہا کردار میں

اک کڑی کی طرح ہوں زنجیر میں احباب کی
میں تو جڑتا ہی نہیں ہوں حلقۂ اغیار میں

مجھ سے ٹکرا کے مرا دُشمن کٹا تو یہ کھلا
اور اِک دیوار ہے اس جسم کی دیوار میں

زندگی ، نقاشؔ! مجھ کو اس لیے آساں لگی
میں نے خود کو پا لیا تھا لمحۂ دُشوار میں

○○○

غزل

–شفقت حبیب شفیق–

سنا ہے بات کا اپنی انہیں ہے پاس بہت
یہ بات ہے تو چلو بات کر کے دیکھتے ہیں

اب اور کونسا نشتر چلانا باقی ہے
وہ داغ کیوں مرے زخمِ جگر کے دیکھتے ہیں

تمام عمر وفا کی تلاش میں گزری
بس اب سراب وفا کے سفر کے دیکھتے ہیں

غبارِ راہ رہا ایک زادِ رہ اپنا
وہ بند کیوں میرے رختِ سفر کے دیکھتے ہیں

رہِ وفا کے شہیدوں میں نام تو ہو گا
کسی کی چاہ میں اِک بار مر کے دیکھتے ہیں

خطا بس ایک ہوئی ان سے دِل لگانے کی
گناہ کیوں وہ مرے عمر بھر کے دیکھتے ہیں

جمالِ یار اُجالے بکھیر دیتا ہے
شبِ سیاہ میں جلوے سحر کے دیکھتے ہیں

کسی سے ربط ، کسی سے گلہ ، کسی کو گلاب
کمالِ فیض ہم ان کے ہنر کے دیکھتے ہیں

OOO

غزل

—توقیر لدھیانوی—

میرے احباب نے جو مجھ پہ گرائے پتھر
میں نے چُن چُن کے وہ سینے سے لگائے پتھر

اس نے کل شب جو مرے گھر میں گرائے پتھر
چوم کر میں نے وہ ماتھے پہ سجائے پتھر

آئینے تن پہ سجا کر جو میں نکلا باہر
خیرمقدم کے لیے سینکڑوں آئے پتھر

میں نے وہ چوم لیے وحشتِ دِل کے ہاتھوں
ان کے کوچے میں جو بکھرے ہوئے پائے پتھر

میں نے جس شخص سے پھولوں کی تمنا کی تھی
اس کی جانب سے مرے واسطے آئے پتھر

مجھ کو منزل پہ پہنچنا تھا بالآخر پہنچا
یوں تو اپنوں نے سدا رہ میں بچھائے پتھر

غزل

—شیخ اعجاز—

دُنیا کے ساتھ دیں بھی نبھانا پڑا ہمیں
دونوں جہاں کا بوجھ اُٹھانا پڑا ہمیں

کتنی ہوئیں برائیاں اور کتنی نیکیاں
ہر اِک عمل شمار میں لانا پڑا ہمیں

واعظ بھی جس کو دیکھ کے فتویٰ نہ دے کہیں
سجدے کا ہر نشان مٹانا پڑا ہمیں

شوقِ جنوں میں لطفِ سفر اس قدر بڑھا
منزل کو راستے سے ہٹانا پڑا ہمیں

ان کی ادائے ناز سے بچنا محال تھا
جاں سے عزیز دِل تھا ، گنوانا پڑا ہمیں

ایسا نہ ہو کہ ہاتھ ستم سے وہ کھینچ لیں
اپنا ہر ایک زخم چھپانا پڑا ہمیں

اعجؔاز پر نوازشیں اپنوں نے کیں سو کیں
احسان غیر کا بھی اُٹھانا پڑا ہمیں